مباحثہ
وہاب اشرفی

مباحثہ

پٹنہ

جلد۹، جنوری تا مئی ۲۰۱۰ء، شمارہ ۳۴

مدیر

وہاب اشرفی

معاون مدیر

ہمایوں اشرف

مجلس مشاورت : ارمان نجمی ، افروز اشرفی

قیمت فی شمارہ: ۵۰: روپے

زرتعاون سالانہ ۲۰۰/روپے

رابطہ

اشرفی ہاؤس ہارون نگر، سیکٹر۲، پھلواری شریف پٹنہ

وہاب اشرفی 09430449489 — ہمایوں اشرف: 09771010715

"ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس" کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶ سے شائع ہوا۔

غیر ممالک میں ''مباحثہ''

''مباحثہ'' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف مما لک میں مباحثہ کے زرتعاون کی ذیل میں صراحت کررہے ہیں۔ آپ ہم سے براہ راست رابطہ قائم کرکے 'مباحثہ' حاصل کرسکتے ہیں۔

امریکہ	تیس (۳۰) امریکی ڈالر
کناڈا	پینتیس (۳۵) ڈالر کناڈا
آسٹریلیا	بیس (۲۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	بیس (۲۰) برطانوی پاؤنڈ
یواےای	پچاس (۵۰) یواےای درہم
عمان	چھ (۶) عمانی ریال
سعودی عرب	پچاس (۵۰) ریال
قطر	پچاس (۵۰) قطری ریال
کویت	چار (۴) کویتی دینار
پاکستان	سات سو (۷۰۰) پاکستانی روپے
دیگر ایشیائی ممالک	پندرہ (۱۵) امریکی ڈالر
دیگر یوروپی ممالک	پندرہ (۱۵) یوروپی ڈالر

نوٹ: بیرونی مما لک کے خریدار زرسالانہ بینک ڈرافٹ یا چیک سے بھیجتے وقت بینک کمیشن کی مناسب شرح بھی زرسالانہ میں شامل کرلیں۔

ہمیں ہمیشہ آپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہتا ہے

ترتیب

خصوصی مطالعہ

ساز تخلیق

سوز دروں

نئی شاعری نئے تقاضے

میرے نقطہ نظر سے

نکتہ اور نکتہ داں

✠ ✠ ✠

اور یہ شمارہ

شمارہ چونتیس آپ کے پیش نظر ہے۔ اس شمارے میں شامل تمام تخلیقات ایسی ہیں جن پر خصوصی توجہ ہونی چاہئے۔ حمد یا نعت لکھنا کار سہل نہیں۔ بہت سے ایسے نکات ہیں جن پر گہری نظر ہونی چاہئے۔ تبھی امکان ہے کہ ان کے اندر شعری اوصاف پیدا ہوں گے۔ اور جس مقصد کے لئے یہ تخلیق ہوئی ہے وہ بھی پورا ہو جائے۔

''افکار'' کے تحت جتنے مضامین ہیں ان میں نئے پہلو تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ شفیع جاوید نے اس بار افسانہ کے بجائے باضابطہ مضمون قلم بند کیا ہے اور نئی شاعری کے امکانات کو زیر بحث لانے کی سعی مستحسن کی ہے۔ لیکن یہ عمومی بحث نہیں ہے بلکہ شکیب ایاز کی شاعری سے متعلق ہے۔ اسے اسی مجموعے میں شائع ہونا ہے۔ بہر حال اس سے نئی شاعری کے امکانات کے ساتھ شکیب ایاز کی شاعری کی بہت سی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ علی احمد فاطمی نے ترنم ریاض کے ناول ''برف آشنا پرندے'' پر تجزیاتی نگاہ ڈالی ہے۔ اس طرف میں محسوس کر رہا ہوں کہ علی احمد فاطمی اپنے دلائل میں زیادہ منطقی ہو رہے ہیں۔ نثر بھی صیقل ہو کر ابھر رہی ہے۔ ''برف آشنا پرندے'' کے بہت سے نکات اس مضمون میں سمیٹ لئے گئے ہیں جن کی تحسین کی جانی چاہئے۔ شوکت حیات ایک نامور اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانے زیر بحث آتے رہے ہیں۔ مشتاق احمد نوری نے ان کے افسانہ ''ذائقہ'' کے مختلف فنی اور فکری پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ نوری خود بھی ایک معیاری افسانہ نگار ہیں لیکن جب کوئی مضمون لکھتے ہیں تو اس کا حق بھی ادا

کرتے ہیں۔ شیخ عقیل احمد نے اقبال اور کالی داس کی منظری شاعری کے احوال نشان زد کرنے کی کاوش کی ہے۔ موضوع نیا ہے اور اس لائق ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔ آفاق عالم صدیقی کا مضمون خالد عبادی کے فن و فکر کی شناخت میں بعض ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو لازماً فکر انگیز ہیں۔ ویسے بھی عبادی کی شناخت ان کے انفرادی لب و لہجے کی وجہ سے ہے۔ آفاق عالم نے کئی جہات سے انہیں سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔

نثار احمد صدیقی نے فکشن کے حوالے سے سلام بن رزاق جیسے اہم افسانہ نگار سے کچھ کلیدی سوالات کئے ہیں۔ اس میں افسانہ اور ناول کے باب میں کئی نکات سامنے آگئے۔ اس طرح کہ سلام بن رزاق کا نقطہ نظر بھی واضح ہوتا چلا گیا۔ یہ گفتگو متنوع سوالات کے اعتبار سے خاصی اہم ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ سلام بن رزاق نے جو جوابات دئے ہیں وہ خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مکالمہ شائع کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے۔

خالد جاوید کا طویل افسانہ " نیند کے خلاف ایک بیانیہ " فن اور فکر کے اعتبار سے کئی نئے پہلو پیدا کر رہا ہے۔ اس افسانے کی ایک ایک سطر خالد جاوید کی فنی اور فکری دسترس کی کہانی پیش کر رہی ہے۔ دراصل خالد جاوید آہستہ آہستہ اپنی سوچ کے اعتبار سے دانشوروں کے حلقے کے ایک رکن بنتے جا رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی ایک کتاب " گابرئیل گارسیا مارکیز " مجھے حاصل ہوئی تو احساس ہوا کہ موصوف کئی لحاظ سے اپنے ذہن کو لچک دار بنائے ہوئے ہیں۔ اس افسانے میں ان کا بیانیہ قابل توجہ ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ اس کی طوالت کے باوجود میں اسے ایک ہی قسط میں شائع کر رہا ہوں۔ شہناز خانم عابدی کا مختصر افسانہ " سجدہ " اس لائق ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔ اسی طرح شکیلہ رفیق کا " ایسا کیوں؟ " بھی قابل مطالعہ ہے۔ سید احمد قادری کا افسانہ " روشنی کے لئے " اس لئے قابل لحاظ ہے کہ اس میں فن کار کے تخلیقی کرب کا احساس ہوتا ہے۔ اسلم جمشید پوری کے مجموعہ افسانہ " لینڈرا " پر اتنے تبصرے سامنے آرہے ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ اب اس کے بارے میں کیا لکھوں۔ بہر حال موصوف کا افسانہ " موت کا کنواں " شائع کرتے ہوئے مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری مسرت میں آپ بھی شریک ہوں گے۔

میں اپنی علالت کے باعث اس بار صرف ایک شاعر پر مختصر مضمون لکھ سکا ہوں، جسے خصوصی مطالعہ کے ذیل میں پیش کر رہا ہوں۔ آئندہ شمارے میں یہ کمی انشاء اللہ پوری کر دی جائے گی۔

" ساز تخلیق " میں نئے پرانے شاعروں کا سنگم یہ ثابت کرتا ہے کہ " مباحثہ " کسی ایک گروہ

سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ یہاں مختلف ذہن کے لوگ ہیں اور سب کے سب معروف ہیں۔ سلطان اختر کی رباعیاں لازماً پسند کی جائیں گی۔ ساجدہ زیدی کی نظمیں اس لائق ہیں کہ بار بار پڑھی جائیں۔ ظہیر صدیقی نے ایک بار پھر اپنی فکری و فنی دروں بینی سے آشنا کیا ہے۔ جمال اویسی کی دونوں نظمیں یقیناً توجہ سے پڑھی جائیں گی اور ان کے فنی اظہارات کی تحسین بھی کی جائے گی۔ نعمان شوق نے اس بار پھر مباحثہ میں اپنی نظم ''کارنامہ'' کے ساتھ شامل ہو کر مجھے ممنون کیا ہے۔

''سوز دروں'' کے حوالے سے شہریار کے پچاس اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔ جو موصوف نے میری درخواست پر خود منتخب کئے ہیں۔ لیکن ان کے کئی بہت اچھے اشعار اس انتخاب میں نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ میں نہیں ہوں۔ محمد سالم امریکہ میں رہتے ہیں، میرے دوست ہیں۔ وہ ادھر بہت سی نظموں کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں ان کی دو غزلیں ہیں۔ ایک غزل فاروقی کے نام ہے تو دوسری راقم الحروف کے نام۔ میں پس و پیش میں رہا کہ میرے نام جو غزل ہے اسے شائع کروں یا نہ کروں۔ لیکن دونوں غزلوں کا انگریزی ترجمہ بھی ہے اس لئے میں نے اسے گوارا کر لیا۔ ظفر گورکھپوری اور رؤف خیر کی غزلیں ان کے اپنے مزاج اور میلان کی ہیں۔ عالم خورشید کا نیا مجموعہ ''کارزیاں'' بھی میرے پیش نگاہ ہے جس پر آئندہ شمارے میں تبصرہ کروں گا۔ اس شمارے میں جو غزل پڑھ رہے ہیں وہ عالم خورشید کے اپنے ادبی رویے کی خبر دیتی ہے اور جس طرح اپنی روش میں وہ فنی کیف و کم کا احساس دلاتے ہیں ان کا بھی احساس ان غزلوں سے ہو رہا ہے۔ راشد انور راشد کی غزلیں قابل توجہ ہیں۔ بہت دنوں بعد موصوف نے ''مباحثہ'' کی طرف توجہ کی ہے۔ ادارہ ممنون ہے۔ احمد کمال حشمی نے اپنی غزل ساقی فاروقی کی نذر کی ہے، اس غزل کا ایک امتیاز اس جہت سے بھی روشن ہے۔ عبید الرحمٰن کی غزلیں دل کو لگتی ہیں۔ ذکی طارق ہرگز سطحی نہیں۔ اس طرح حسن ظہیر اور اختر شاہ جہاں پوری کی غزلوں کا اپنا امتیاز ہے۔

''نئی شاعری نئے تقاضے'' کے تحت ارشد عبد الحمید کی بیس غزلیں شائع کی جا رہی ہیں۔ یہ تمام غزلیں ان کی انفرادیت اور ان کی فنی وابستگی کا ثبوت بھی ہیں۔ مجھے باضابطہ ایک مضمون لکھنا چاہئے تھا جو اس وقت ممکن نہیں۔

چار کتابوں کے تبصرے پر بھی آپ کی نگاہ ہونی چاہئے۔ میں نے اس بار صرف دو تبصرے کئے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اب میں زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ ہمایوں اشرف کی تحریر میں

اب دھارا پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ راجو خاں نئے لکھنے والوں میں ایک ہیں۔ لیکن انہوں نے کتاب کا مطالعہ گہرائی سے کیا ہے۔ اس لئے تبصرہ قابل لحاظ ہے۔ آپ اپنی بے لاگ رائے سے نوازیں۔

''نکتہ اور نکتہ داں'' کے خطوط سے بہت سے سوالات آپ کے ذہن میں ابھریں گے۔ آپ بھی ان خطوط کی طرف توجہ کیجئے اور اپنی رائے سے مجھے نوازیئے۔

ترقی پسند ادب کے اہم ترین ستون ڈاکٹر محمد حسن اب ہمارے درمیان نہیں۔ ۲۴/اپریل ۲۰۱۰ء کو رات کے ساڑھے نو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ موصوف اردو ادب کے صرف نامور نقاد ہی نہیں، شاعر، فکشن نگار، ڈرامہ نگار اور صحافی بھی تھے۔ یوں تو وہ ترقی پسند تھے، لیکن انہوں نے بیحد لچک دار ذہن پایا تھا۔ لہٰذا ان کی نگاہیں ہمیشہ وا رہی تھیں۔ فکر و نظر میں بڑی وسعت تھی۔ ان کی اہم کتابوں میں ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر'' کلاسیکی حیثیت رکھتی ہے۔ رومانوی تحریک پر بھی ان کی کتاب بیحد اہم سمجھی جاتی ہے۔ ''ادبی سماجیات'' اور ''معاصر ادب کے پیش رو'' جیسی کتابیں بھی کم اہم نہیں۔ ان کے ڈراموں میں ''ضحاک'' سبھوں کی نظر میں ہے۔ میں نے ایک مضمون ''قومی تنظیم''، پٹنہ، ۱۰/مئی ۲۰۱۰ء میں ان کے بارے میں تفصیل سے کئی امور قلمبند کئے ہیں۔ وہ میرے کرم فرما اور محسن بھی تھے۔ میں ان کی قربت کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ مجھ پر کرم کی بارش کرتے رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے انتقال سے اردو ادب کا جو نقصان ہوا ہے وہ تو ہے ہی، میرا بھی کم نقصان نہیں ہوا۔ لازماً یہ میرے لئے ذاتی المیہ بھی ہے، جسے میں تا حیات فراموش نہیں کر سکتا۔

خدا موصوف کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

وہاب اشرفی

حمد

شارق عدیل

ملیں منزلیں تو سمجھ گیا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
دلِ غم زدہ یہ پکار اٹھا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
تھیں جدا تمام شریعتیں جو پیمبروں کو عطا ہوئیں
مگر ایک سب کا پیام تھا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
کبھی کائنات و حیات کے پڑھو تم صحیفے کو غور سے
ہے ورق ورق پہ لکھا ہوا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
ابھی مست اپنی انا میں ہے یہ تمام شہر فراعنہ
یہاں کون کس کو بتائے گا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
ترے راستے چمک اٹھیں گے نئی منزلوں کی نوید سے
کوئی تو بھی بار الم اٹھا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے
جو جہان شعر و سخن میں تھا کبھی ایک ذرہ حقیر سا
اسے رشک مہر بنا دیا کہ خدا بہت ہی عظیم ہے

✠✠✠

مناجات

شاہین

رب بو د و نبود و نادیدہ
تجھ سے کچھ بھی نہیں ہے پوشیدہ
اے کہ ہے بے نظیر تیری ذات
تجھ سے ہے سارے جزو وکل کو ثبات
اک کرم کی نگاہ ہم پر ڈال
ہم کہ ہیں دل فگار و خستہ حال
سر ہمارا پھرے نہ غفلت میں
دل نہ ہو بے مزہ مصیبت میں
ہو گھڑی فتح یا ہزیمت کی
دے چمک آنکھ میں بصیرت کی
خامشی جہل کی دلیل نہ ہو
بات بے وجہ بھی طویل نہ ہو
ہو کمال ہنر میں اپنا نام
نام سے ہم رکھیں نہ لیکن کام
گر ہو ثابت غلط ہمارا طریق
دے بدل جانے کی ہمیں توفیق

مفلسی سے ہزار وحشت ہو
مفلسوں سے ہمیں محبت ہو
زیردستوں کی ہم نوائی کریں
ظلم سے طاقت آزمائی کریں
سازش رنگ و نسل پہچانیں
ہر کہہ و مہ کو محترم جانیں
اپنی تاریخ مستند کر دیں
جو روایت غلط ہو رد کر دیں

٭٭٭

نعتیہ دوہے

جلیس نجیب آبادی

سب کے اونچے مرتبے سارے نبیؐ مہان
سب سے بڑھ کر وہ جسے حاصل ہوا قرآن

ہیرے ، موتی ، سیم و زر اس نظر میں دھول
جس کی آنکھوں کو ملی خاک در رسولؐ

آنکھوں کو ٹھنڈک ملی ، ہردے کو آرام
جب ادھروں پر آگیا آقا تیرا نام

مدنی آقا مصطفےٰؐ تیری دیا اپار
دھرتی سے آکاش تک تیری جے جے کار

نظمیں ، غزلیں ، گیت کیا ، کیا دوہے اشعار
میری سب رچناؤں میں بھردے اپنا پیار

✠✠✠

نئی شاعری کی بشارت

شفیع جاوید

بانکی پور سے پچھم دروازے کی طرف جب بھی میرے قدم اٹھتے ہیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے جیسے ہر من ہس کا سفر مشرق ہو۔ روح کے غسل کا سفر۔ راستے میں ملنے والے پرانے پرانے مکان، جھکی جھکی ہوئی بالکنی، لکڑی کے باریک کاموں کی جالیاں، زمانوں کے سرد و گرم جھیلے ہوئے کچھ شکستہ اور کچھ بچی ہوئی برجیاں، کچھ خستہ جھروکے، ٹیڑھی میڑھی لاہوری اینٹوں کی دیواروں پر کھپریل کی چھاؤں، پتلی پتلی گلیاں، خم کھاتی ہوئی، گم ہوتی ہوئی، کبھی ایک پہلو نمایاں کبھی دوسرا پہلو پوشیدہ۔ ہمیں ان گلیوں میں اکثر عجیب سی سرگوشیاں سنائی دیتیں، جیسے طہران کی مسجد کے ویران سناٹے صحن میں مختار مسعود نے محسوس کیا تھا کہ وہاں تھا تو کوئی نہیں لیکن لگتا تھا کہ مجلس قائم ہے، ہر گوشہ پر، ہر دیوار بولتی ہوئی سی، جانے کہاں کہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا ہی کچھ ہوا ہر مرتبہ میرے ساتھ بھی کہ جب بھی شہر عظیم آباد کی طرف میرے پاؤں بڑھے تو ایک داستان گو ساتھ ہو گیا اور ساتھ ساتھ چلنے والا ورق گرداں بھی اپنا کام کرنے لگے۔ کچھ ایسا ہی ہوا تھا ۱۹۶۷ء کی جاتی ہوئی گرمیوں کی ایک سہ پہر کو کہ ہم سب ایک ساتھ راجندر نگر سے پٹنہ سیٹی کے لئے نکلے تھے۔ وہ زمانہ ہمارے

بھرے پرے گھر کا تھا۔ ہم بہت سے لوگ ساتھ گئے تھے، باغ کالو خاں میں یوسف چچا اور پتو چچی کے یہاں، دونوں طرف سے خاندان کے درجن سے بھی کچھ زیادہ ہی افراد، اونچی آوازوں میں زور زور سے گفتگو، پرانی باتوں، پرانے قصے قضیے کی یادیں، نئی باتوں کی تلاش اور ان سب کے باوجود داستان گو میرے ساتھ تھا اور ورق گرداں اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ میری کھوئی کھوئی سی خاموشی انہیں ریکارڈ کئے جا رہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں، بہت سے لڑکے، کئی بزرگ، یوسف چچا اور ہم 'ارول' آرہ اور گیا کی گفتگو، ایک سلسلہ تھا جو رکتا ہی نہ تھا۔ چائے کے بعد مجھے سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رکھ رکھاؤ کا زمانہ تب تک قائم تھا۔ بڑوں کے درمیان سے ہم باہر نکل آئے۔ سامنے مٹی کا چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ میں نے سوچا اس کی دوسری طرف کی جگہ ٹھیک رہے گی۔ اس طرف بڑھے تو دیکھا ایک چھریرا، خوبصورت، گندمی سانولا نوجوان بڑے پرکشش انداز میں سگریٹ نوشی میں مصروف ہے۔ میں اپنی جیب سے سگریٹ نکالنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنا پیکٹ پیش کر دیا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ انجانے میں بھی ایسا اخلاق؟ ہمارا تجربہ تھا کہ نئے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے تو احباب اپنے کالروں پر مزید کلف لگایا کرتے تھے اور یہاں بے ساختگی جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے سے بے تکلف ہوں۔ ہم کچھ ہچکچائے تو کہا گیا ''میں شکیب ایاز ہوں اور جانتا ہوں آپ شفیع جاوید ہیں۔ آپ لوگ پتو پھوپھی کے یہاں آئے ہیں نا؟ آپ کے اس قدر تذکرے یہاں ہوتے رہے ہیں کہ ہم آپ سے پورے طور پر متعارف ہو چکے ہیں۔'' یہ میری اور شکیب ایاز کی پہلی ملاقات تھی اور ایسا لگا کہ آنکھ نہ جانے پر دل پہچانے والی بات ہے۔ داستان گو نے ہلکی سی سرگوشی کی ''عظیم آباد کی خاک ہے۔''

اس کے بعد غالب صدی کے دن آ گئے۔ وہ ۱۹۶۹ء کا سال تھا۔ سردیوں کے ان دنوں میں ہم جیسے پراگندہ طبع لوگ اکثر سیاہ شروانی پہنا کرتے تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں غالب صدی کا پروگرام چل رہا تھا کہ اچانک مجھے لگا میں آئینے کے سامنے ہوں۔ شکیب ایاز سیاہ شروانی میں ملبوس سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ قرابت تو تھی ہی اب کے دل کی راہیں بھی شاید مل گئیں۔ کئی ادبی نشستوں میں خوب ملاقاتیں رہیں کہ ان دنوں ہم پٹنہ کی ادبی نشستوں میں تواتر سے شریک ہوا کرتے تھے اور ان ہی دنوں ایک شام راجندر نگر میں میری رہائش گاہ پر ایک یادگار ادبی نشست ہوئی۔ جس میں شکیب، محمد حسن اور قاضی عبدالستار کو ساتھ لے کر آئے۔ وہ ایک تاریخی اور معرکۃ الآرا ادبی نشست اس معنی میں تھی کہ پٹنہ کے تقریباً سبھی نمایاں اور نوجوان لکھنے والے موجود تھے اور ادب، کے نئے اور پرانے موضوعات پر بہت واضح طور پر اور

کھل کر باتیں ہوئی تھیں اور دیر رات تک ہوتی رہی تھیں۔ جب یہ نشست ختم ہوئی تو شکیب ایاز کی ادب شناسی اور شعری حسیت کے تاثرات ہم پر دو چند ہوئے اور ہم پر یہ بھی کھلا کہ شرافت، ذہانت اور متانت ان کی شخصیت کا خمیر ہیں اور اس تثلیث پر مستزاد ہے ان کا دل بسمل۔ ان دنوں ''شب خون'' ان کی مشہور غزل آئی تھی، جسے ہم لوگوں نے ضد کر کے اس نشست میں پڑھوایا تھا۔ غزل کے سوز اور شکیب کی آواز کی غنائیت نے ہمارے دلوں پر دستک دی تھی اور وہ ڈھیر ساری داد لے کر اٹھے تھے۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لفظ کا خالی کاسہ مجھ سے
مانگے معنی کی خیرات
پندار تنہائی ٹوٹے
سائے سے کرتا ہوں بات
سپنوں نے بخشا تھا کیا کیا
آنکھ کھلی تو خالی ہاتھ

احمد جمال پاشا بھی اس محفل میں موجود تھے اگر گل وگلزار کی کیفیتیں برپا کرنے میں مصروف تھے کہ ان کے اصرار پر بطور خاص شکیب نے یہ دو اشعار بھی سنائے، جن سے ان کی یکتائی واضح اور جدید حسیت مستحکم ہوئی:

رنگ ذہن عدو نے ایسا بھرا
میری تصویر بے مثالی ہوئی
ختم ہوتے ہی چائے کی دعوت
پرتکلف نگاہ خالی ہوئی

تخلیقی منزلوں کو قطع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ممکنات اور امکانات کی تلاش ہمیشہ جاری رکھی جائے۔ شکیب ایاز نے اپنے اشعار میں ان امکانات اور ممکنات کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھی ہیں۔ ادا جعفری نے ادب وشاعری کے لئے جن نکتوں اور جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہ یوں ہے کہ ''شاعری بھی زندگی کی طرح کسی ایک موڑ پر ٹھٹھک کر کھڑی نہیں رہ جاتی۔ ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ہر عہد کی شاعری اپنی ترجیحات خود متعین کرتی ہے۔ کبھی ارادی اور کبھی غیر محسوس طور پر شعر وادب کی دنیا مسلسل تغیر آشنا رہی ہے۔ نئی لفظیات کا دور آتا ہے۔ نئے محاورے جنم لیتے ہیں۔ کچھ الفاظ اور رویے اپنی عمر پوری کر چکے ہوتے ہیں۔ تخلیق

ادب اور زبان دونوں کے تسلسل اور قیام کا ثبوت بھی یہی ہوتا ہے............شاعری اپنی سوانح عمری بھی ہوتی ہے اور اپنے عہد کے شب و روز کا منظر نامہ بھی ......ان جملوں کے تناظر میں شکیب ایاز کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کاروبار مرے دل نے انتخاب کیا
جبین حرف پہ لکھ کر اسے کتاب کیا
وہ ڈھونڈتا رہا مجھ کو جہان معنی میں
وہ میں ہی تھا کہ جسے میں نے دستیاب کیا

عہد کے تقاضے، جدید حسیت، اپنے عہد کے شب و روز کا منظر نامہ اور نئی لفظیات کے ذائقے ان اشعار میں نئے امکانات کے ساتھ کس قدر واضح ہیں:

ورق دہر پہ تحریر جنوں لکھ دینا
دونوں آنکھوں کو قلمدان پہ رکھ دیتے ہیں

فضا میں بولتے ہیں تتلیوں کے پر جیسے
رواں ہے کرمک شب تاب، پھول بن کی طرف

پہر ڈھلتے یہاں ہوتی ہے زمزمہ خوانی
چمن کے فرش پہ آمد کسی سفیر کی ہے

اور غزل کے تعلق سے لفظیات کے نئے تجربے:

ہم نے دیا مزاج ہنر لفظ لفظ کو
ہم سے نئی غزل کی شریعت ادا ہوئی

جلوس کم ہنراں اس کے دائیں بائیں ہے
بڑھا جو میں تو یہی بھیڑ راستہ دے گی

چہرہ چہرہ غزلیں نظمیں، نظریں نظریں افسانہ
فن نے کیسا روپ لیا ہے تم بھی چپ اور ہم بھی چپ

کیا رات کی کتاب ہیں چہرے نئے نئے
کھلتے ہیں روشنار دریچے نئے نئے
اٹھئے شکیب ایاز کہ اب بھور ہو گئی
پڑھنے لگے پرند وظیفے نئے نئے

قدرت بیان اور خیال کی آمیزی سے معمور یہ اشعار گویا عالم ظاہر میں باطن کی ہواؤں کا چلنا ہے اور ان کو پڑھنا میرے لئے ایک وجد آفریں تجربہ ہے۔ یہ احساس کی ایک سطح ہے کہ تم بھی چپ اور ہم بھی چپ کہ بھور ہو گئی۔ کوئی کچھ نہ سن سکا، نہ کہہ سکا۔ پھر بھی سب کچھ کہہ دیا گیا ہے بے چین کر دینے والی خاموشی کے درمیان، پرندوں کے نئے وظیفوں کے درمیان، بھور کے آلوک میں۔ ان دل نشیں اشعار کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جذبے کی صداقت ہی اچھی شاعری کی ضمانت ہوتی ہے۔ یہ جو نئے نویلے انداز ہیں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ تحریر کا سحر تو دراصل یہ ہے کہ ہم محسوس کریں کہ اس سے پہلے یہ بات اس طرح نہیں کہی گئی ہے۔ ہمارے سامنے جو جدید شاعری آ رہی ہے، یہ اس کی ایک جاندار پر کیف کڑی ہے۔ یہاں وقت، مقام، جذبہ اور ذہنی تجربہ ہے وہ تخلیقی لمحوں کا گراں مایہ سرمایہ ہے۔ یہ Reflective تخلیق کاری ہے۔

ایک شناسا نے کبھی کہا تھا (یہ بہت دور دنوں میں سے ایک دن کی بات ہے) کہ شکیب تنہائی کے شاعر ہیں۔ میں خاموش رہ گیا تھا، راون کی لنکا میں تو سب ہی باون گز رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد منیر نیازی کے سلسلہ میں احمد ندیم قاسمی کی یہ تحریر میری نظر سے گزری "بعض اصحاب کہتے ہیں کہ منیر نیازی تنہائی کا شاعر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہر اچھا شاعر تنہا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گردو پیش کی صورت حالات پر قناعت نہیں کر سکتا اس لئے تنہا ہے، وہ اس بدصورت دنیا میں خوب صورتیوں کا متلاشی ہے اس لئے تنہا ہے۔" اب اس شعر کو دیکھئے کہ جمالیاتی تاثرات کے ساتھ شکیب کس طرح تنہا ہیں:

میں زرد شاخ گل کا نہایت اداس پھول
دنیا وہ تیز و تند سا جھونکا کہ دم نہ لے

مانوس طرز فکر اور روندے ہوئے اسلوب سے کنارے ہو کر فکر و استغراق میں ڈوب کر یہ شعر کہنے کی سعی کی گئی ہے۔ جدید رخ کے حامل ہوتے ہوئے بھی شکیب ایاز کے یہاں منفی اثرات نہیں ہیں، بلکہ وہ بصیرت ہے جو فکر و تامل کی منزلوں سے گزرتی ہوئی نیا تخلیقی ذائقہ مہیا

کرتی ہے۔ یک رنگی اور یکسانیت سے کوسوں دور شخصی تاثر اور انفرادی احساس ان کی بساط شاعری کے امتیاز ہیں۔ شکیب صرف اپنے داخل میں پناہ گزیں نہیں ہیں بلکہ خارجی اثرات سے بھی ان کے اشعار مرتب ہیں کیونکہ وہ زندہ اور زندگی خیز رویوں کے تخلیق کار ہیں:

جہاں پہ نقش قدم آپ چھوڑ جاتے ہیں
وہیں پہ ٹھہری ہوئی کائنات ہوتی ہے

میں گھر گیا ہوں رنگ سفید و سیاہ میں
وہ خوش ہے زعفران کی اک شاخ توڑ کر

جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ زندگی اپنی معنویت کھو چکی ہے، وہ صرف ایک حد تک ہی درست کہے جا سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صد فی صد درست نہیں ہیں کیونکہ زندگی کو نئے معنیٰ بھی مل جاتے ہیں، نیا راستہ بھی آ جاتا ہے، نئی روشنی بھی مل جاتی ہے۔ شاید ایسے ہی پہلو کی وضاحت کے لئے محمد سلیم الرحمٰن نے ایک موقع پر یہ لکھا تھا کہ " کہتے ہیں کہ عالم بالا میں ایک بہت پھیلاؤ والا گھنا درخت ہے جس پر ہمیشہ ایک ہی وقت میں خزاں اور بہار چھائی رہتی ہے۔ جب تیز ہوا کے جھونکے آتے ہیں تو سوکھی اور مرجھائی ہوئی پتیاں ٹوٹ کر گر جاتی ہیں...... ٹوٹا پتہ ڈال سے لے گئی پون اڑا...... زندگی کی سوکھی پتیوں اور ہری پتیوں کا کھیل ہمیشہ جاری ہے۔ زندگی وہ فینکس ہے جو راکھ بھی ہو جاتی ہے اور پھر اپنی راکھ سے پیدا بھی ہو جاتی ہے اور شکیب ایاز اس دھوپ چھاؤں کی کیفیت کو اپنے اشعار میں یوں پیش کرتے ہیں:

اب پرندے پھر ہوا میں تیرنے کی ضد میں ہیں
جب نکل آئے انہیں کچھ بال و پر اچھا لگا

کہاں سے باد صبا گل کتر کے آئی ہے
جھکی ہوئی نئی خوشبو ہے پیرہن کی طرف

بسر کریں گے کرائے کے شامیانے میں
مرا مکان مری لاش بونے والا ہے

کسی دریائے بے پایاں میں اتریں، ڈوب جائیں ہم
یہ آب جو ہے، اس میں گردش سیلاب کیا دیکھیں

اطہر فاروقی سے گفتگو کرتے ہوئے اختر الایمان نے عمدہ شاعری کے لئے کچھ اہم نکتوں کی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

"اچھی شاعری کے لئے پہلی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ روایتوں کی حدود سے انحراف تو کرتی ہو مگر شاعر روایتوں سے کماحقہ، واقف ہو۔ اچھی شاعری کی دوسری شرط شاعری کا نیا پن ہے...... میں شاعری کو مذہب کی طرح مقدس اور مکمل انہماک سے کرنے کی شئے سمجھتا ہوں ...... ہندوستان کا موجودہ معاشرہ بحیثیت مجموعی اپنے ماضی سے بالکل مختلف ہے۔ معاشرے میں ہر سطح پر شکست و ریخت کا عمل جاری ہے جو بالکل فطری بات ہے اسی لئے ہندوستانی زبانوں کے ادب میں آپ کو کہیں بھی باسی پن نظر نہیں آئے گا...... شاعری کا نام ہے پوری فہم و ادراک کے ساتھ زندگی کے مسائل کا بیان اور اس کے لئے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے......"

اختر الایمان نے یہ جو اچھی شاعری کے معیار قائم کئے ہیں، ان پر شکیب ایاز کے یہ اشعار بھی کھرے اترتے ہیں:

وہ رات جو آنے والی ہے، وہ رات بہت ہی کالی ہے
لو دھیرے دھیرے تیز کرو ڈرتے ہیں چراغ شام سے ہم
ویران حویلی روتی ہے سناٹے ماتم کرتے ہیں
اس شہر کے ملبے کہتے ہیں واقف ہی نہ تھے انجام سے ہم

کبھی تو لوٹ کے آئے گا وہ وطن کی طرف
چراغ وصل ہیں گردش میں انجمن کی طرف

کسی نے ایسا طلسم یقیں نہیں دیکھا
کہ اس کے بعد اسے پھر کہیں نہیں دیکھا
ستارے ٹوٹ کے گرتے تھے جانماز پہ رات
کہ ایسا عرش نے صاحب جبیں نہیں دیکھا

غرض کہ یہاں روایتوں کی پاسداری بھی ہے اور ان سے شکیب ایاز نہ صرف متعارف اور واقف ہیں بلکہ ان کی آبیاری میں بھی مصروف ہیں، پوری فہم اور ادراک اور مکمل انہماک کے ساتھ۔ ہم یوں کہیں کہ یہ اشعار ریاضت کے وہ موتی ہیں جنہیں شان کریمی بھی منتخب فرمالیں تو تعجب نہ ہو۔

آج یہ لکھتے ہوئے اچانک کسی شاعر کا ایک مصرعہ یاد آ گیا......اک مہک سی دم تحریر کہاں سے آئی......اور ساتھ ہی پشتو کے ایک شاعر کا یہ کہا یاد آیا "اے خدا مجھے گلاب بنا دے کہ میں محبوب کی آغوش میں پتی پتی ہو کر بکھر جاؤں۔"

اور اب اس پس منظر میں ایاز کا یہ شعر حاضر ہے:

کہ میری سانس میں خوشبو اسی کے نام کی ہے
اسی کا عکس بہت دور تک سفر میں رہا

اور یہ شعر:

صدائے گل فروشاں مجھ کو گھر جانے کو کہتی ہے
نئی تتلی مگر اس گل پہ مر جانے کو کہتی ہے

اب ان تیس پینتیس برسوں کے بعد شکیب ایاز پر کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو لگتا ہے اپنے آپ کو Rewind کر رہا ہوں، اس لئے میری یہ ناچیز تحریر نہ تو شناس نامہ ہے اور نہ سپاس نامہ، یہ تو صرف اعتراف ہے دل پہ تراز و ہونے والے ان چند اشعار کا جن کی بیاض ابھی بھی تیاریوں کے مراحل میں ہے (کیونکہ شکیب ہم سے بھی زیادہ لاپرواہیں) کہ میر تقی میر جب اپنا دیوان پچپن سال کی عمر میں شائع کرانے والے تھے تو اگلے وقتوں کے لوگوں نے کہا تھا کہ انہیں اتنی جلد کیوں پڑی ہے، ابھی تو انہیں مزید اشعار کہنے چاہئیں تا کہ ان کے فن پر اور صیقل ہو جائے اور دیوان میں اچھے اشعار کا انتخاب ہو سکے۔ شاید ایسا ہی کچھ رہا ہے کہ شکیب کی "بشارت" کی اشاعت میں تاخیر پہ تاخیر ہوتی چلی گئی ہے۔ آج ان دور دنوں کی یادوں کے ساتھ بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو، بہار، پٹنہ کی نشستیں اور ان کے پروگرام، رانچی میں جب شکیب آل انڈیا ریڈیو میں P.Ex کے عہدے پر مامور تھے تو وہاں کی نشستیں، پرکاش فکری، وہاب دانش، وحید الحسن اور طارق ندیم کی صحبتیں، وہ بے فکر قہقہے، وہ بے ریا ملنا ملانا، رانچی کی بارشوں میں بھیگنا، ٹھنڈک سے وہاں کی بچتے بچتے چلنا اور گیا کے میرے دورے، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، اصح ظفر، وہاب اشرفی کی صحبتیں، رسالہ "آہنگ" کو خوب سے خوب تر بنانے کے منصوبے، پٹنہ

میں خدا بخش لائبریری میں آہستہ خرامی اور ریڈنگ روم میں سرگوشیوں کی حد تک دھیمی آوازوں کی گفتگو، کنکڑ باغ کی میری رہائش پر شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ بیٹھنا اور نئے عزائم کا اعادہ، بہار اردو اکادمی کا معرکتہ الآرا فکشن سیمنار، اردو بازار اور بک امپوریم اور پٹنہ مارکیٹ کے چکر۔ اس مختصر سے مضمون میں جتنا کچھ یاد آرہا ہے ان سب کو سمیٹنا بہت مشکل ہے، بہت سی آوازیں آرہی ہیں، کبھی قیوم قاعد ابھر رہے ہیں، کبھی پروفیسر نرمادیشور پرساد سامنے آ جا رہے ہیں، کبھی مظہر امام کی قیام گاہ (مسکن کوٹھی) ایک منظر بنا جاتی ہے جہاں ہم بہت سے اکٹھے بیٹھے ہیں، احمد یوسف ہیں، حسن نعیم ہیں، انور عظیم ہیں اتنے سارے ہم سب کہ میری آنکھیں جھلملائی جارہی ہیں اور آپ واقف ہیں نا؟ کہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے کچھ دیکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، اور ان سارے مقامات و معاملات میں شکیب ہمارے شانہ بہ شانہ رہے۔ کل کیا ہو پتہ نہیں ہم رہیں نہ رہیں لیکن شکیب انشاء اللہ اس باب میں مجھ سے جو کچھ چھوٹ رہا ہے وہ ضرور قلمبند کر دیں گے کیونکہ:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا
(ناصر کاظمی)

اس پوری مدت میں اب تک میں شکیب کو جتنا کچھ جان سکا ہوں، اس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ذاتی مفاد کی قربان گاہ پر انہوں نے ضمیر کو کبھی قربان نہیں کیا۔ کچھ لوگوں کا ذائقہ ازل سے ہی خراب آتا ہے کہ شہد کی بوندوں میں بھی تلخی نکالتے ہیں، شکیب کو ہم نے ہمیشہ سرتاسر خوش ذائقہ پایا، خوش گفتار بھی اور وضعدار بھی۔ انہیں چشمہ آب حیات کی تلاش نہیں بلکہ آبشار محبت کی تلاش رہی ہے۔ انہیں سکہ رائج الوقت ہونا کبھی نہ آیا کیونکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہاتھ باندھے کمر خمیدہ کھڑے رہتے۔ شکیب حسن نعیم کی روایات سے بندھے ہوئے رہے ہیں اسی لئے ان سے یہ کبھی ممکن نہ ہو سکا۔ شاید اسی لئے حسن نعیم فنی اور شخصی دونوں اعتبار سے ان کے معترف بھی تھے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ غیر شعوری جذبات شاعری کا امتیاز ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت شکیب کی پوری شاعری پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ وہ برہنہ کہنے کے شاعر نہیں ہیں ان کی شاعری مستور ہے۔ انہوں نے اپنی حرمت اور عزت نفس کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ تکلف اور تصنع کا ورق کبھی نہ چڑھا، ہاں محتاط ہمیشہ رہے لیکن شائستگی کا دامن کبھی نہ چھوٹا۔ شاعری کی منزلیں انہوں نے دیدہ و دل سے طے کی ہیں۔ خوش فکری ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ فن اور

زندگی جب ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو ایسے اشعار ہمیں پڑھنے یا سننے کو ملتے ہیں۔ شکیب ایاز کے یہ اشعار ان کی اپنی ذات کے ساتھ ساتھ زمانے کے گرد بھی گردش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شخصیت اور شاعری ایک دوسرے سے اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی تفسیر ہے یا ان کی شخصیت ان کی شاعری کی تشریح ہے۔ کیونکہ جب شاعری میں رچاؤ اور شخصیت میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے تو شاعری شاعر کی ذات میں گم ہو جاتی ہے اور شاعر شاعری کی پنہائیوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

تنہائی، عدم تحفظ، زندگی کی بے معنویت، اخلاقی خلا، ذات کا کرائسس، فرد کی گمشدگی، فنا کا خوف، حالات کی یکسانیت، مشینی زندگی کا جبر، اقدار کا انہدام —— آج یہ سب ہماری زندگی کے وہ پہلو ہیں جنہوں نے ہمیں جبر و اختیار کے تضاد میں اس طرح مبتلا کر دیا ہے کہ ہم Schizophranic ہو گئے ہیں یا پھر یوں کہیں کہ ہم اپنا توازن کھو کر Sleep Walkers میں شامل ہو گئے ہیں۔ آیئے دیکھیں ایاز ان کیفیتوں کو، جبر کو کس طرح بیان کرتے ہیں:

ان کے لئے نہ قبر، نہ کتبے نہ مرثیے
تنہائیوں کی قید میں جو گھٹ کے مر گئے

ہر فرد اپنی ذات میں گم ہو گیا ہے آج
ہر لحہ بڑھ رہے ہیں وجودوں کے فاصلے

اور ایک بہت مختصر سی، بوٹی سی نظم آج کے المیہ کا ایک نیا منظر پیش کرتی ہے:

غم والم کے گراں بوجھ کو اٹھائے ہوئے
فصیلیں خم ہیں، در و بام سر جھکائے ہوئے
کواڑیں مہر بہ لب
کھڑکیاں ہیں سوئی ہوئی
نہ گفتگو نہ ترنم
نہ قہقہوں کی الاپ
کسی کے قدموں کی آہٹ نہ چوڑیوں کی کھنک
اداسیوں کے اندھیروں میں ڈوبی دیواریں
سنا رہی ہے کہانی گزرتے لمحوں کی

اور اس تناظر میں شاعر کی آنکھ یہ دیکھتی ہے:

یہ تیرگی کا شہر ہے وہ روشنی کا شہر
خوابوں میں بٹ گیا ہے میری زندگی کا شہر
جس موڑ پر رکے نگہ بدگماں اٹھی
یہ اپنا شہر ہے کہ کسی اجنبی کا شہر

یہ کس نے دشت کی تصویر آنکھ میں رکھ دی
سکوت ایسا برہنہ نشیں نہیں دیکھا

اس کرب انگیز سناٹے میں ایک بازگشت:

شکیب ایاز! یہ دلی کی جامع مسجد ہے
پکارتی ہے جو سیڑھی جناب میر کی ہے

اور ریزہ ریزہ ہونے اور بکھرنے کی یہ صورت:

تجویز کچھ عجیب سی مجھ کو سزا ہوئی
کوفہ وطن ہوا تو گلی کربلا ہوئی

ندی سنک اٹھی ، در و دیوار ڈھ گئی
میرا وجود دیکھ کے پاگل ہوا اٹھی

حال زار یہ ہے کہ:

اپنا تو حال میرؔ سے زیادہ خراب ہے
چھت کھل گئی تو ہاتھ بھی سایہ نہ کر سکے

یہ غور کرنے اور محسوس کرنے کی بات ہے کہ پریشان حالی کے عقب سے یہ اشعار طلوع ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں پریشان خیالی قطعی نہیں صرف حیرت ہے، تحیر ہے، کف افسوس ضرور ہے لیکن بصیرت کے ساتھ موجود ہے۔

عجیب وقت آن پڑا ہے کہ ہم بادلوں کی اٹکھیلیاں نہیں دیکھتے، شہروں میں چاندنی نظر نہیں آتی، پرندوں کا رقص نہیں دیکھتے، ان کی زبان نہ سمجھتے ہیں نہ سنتے ہیں، کلیاں کب چٹکتی ہیں ہم نہیں جانتے ہیں، درخت کی چھاؤں غائب ہوگئی، ہم ان کے دوست نہ رہے، ندیوں کا

جلترنگ سننے کی فرصت ہمیں نصیب نہیں ہے، اب ہم قدرت کو مسخ کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں، جنگلوں سے، پہاڑوں سے اور ندیوں سے ہم محبت نہیں کر سکتے کیونکہ اب ہم ان سے ڈرتے ہیں۔ ہمارے خوف نے ہماری خود غرضی نے، ہماری لالچ نے ہمیں فطرت سے بہت دور پہنچا دیا ہے، پھر بھی دھرتی ماں کا رول ادا کرتی ہے، ہمیں ان سب کے باوجود بہت کچھ دے دیتی ہے۔ اتنا کچھ کہ اب تک ہم پیاسے نہیں مرے، ہماری سانسیں قائم ہیں کہ اب بھی پھول کھلتے ہیں، ان میں خوشبو قائم ہے، پھلوں کے رس اب بھی میٹھے ہیں، ہوائیں اب بھی ٹھنڈی ہیں اور درختوں کے سائے تھکے ماندوں کو اب بھی آرام دیتے ہیں۔ اس طرح عام دنیا کا رویہ کچھ ہوتا ہے، زمانے کا چلن اپنا ہوتا ہے، شاعر کی چشم باطن کچھ اور ہی دیکھتی ہے، اس کا قرینہ کچھ اور ہوتا ہے اور وہ یوں ہوتا ہے:

تو اگر انتظار میں ہوتا
سارا منظر شمار میں ہوتا
بند کلیاں بھی گفتگو کرتیں
بوٹا بوٹا قطار میں ہوتا
سبزے اٹھ اٹھ کے جھانکتے ہوتے
سارا نقشہ حصار میں ہوتا
دامن گل ہوا سے ہلتے بھی
شعلۂ جاں چنار میں ہوتا
تختۂ گل پہ سر تلے ہوتے
کیا مزہ گیرودار میں ہوتا
یہ تو میرے لہو کا سرقہ ہے
ورنہ پھر کیا بہار میں ہوتا

غزل کے اشعار کی بے ترتیبی اور بے ضابطگی کے پیش نظر اسے 'نیم صنف سخن' کہہ دیا گیا تھا۔ شکیب کی یہ اور اس کے علاوہ کئی غزلیں اس موقف کی تردید کرتی ہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری نے ایک موقع پر فرمایا تھا: ''تسلسل غزل کے حسن میں اضافہ کرتا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بہترین شعراء کی بہترین غزلوں میں غیر شعوری طور پر ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ غزل میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔''

جوش ملیح آبادی نے اصرار کیا تھا کہ اور زور دے کر کہا تھا کہ اعلیٰ شاعری کے لئے حساسیت اور تفکر، ان دونوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک کامیاب غزل گو کے لئے ناصر کاظمی نے یہ شرطیں رکھی تھیں کہ وہ شاعر ہو، سچی بات کرنے کا قائل ہو، واردات اپنی ہو اور اسے اپنے لفظوں کی قیمت معلوم ہو۔ ان قائم کردہ معیاروں پر بھی شکیب ایاز کے اشعار کھرے اترتے ہیں کہ مشاہدے کی وسعت کے ساتھ ان کے یہاں ایک خاص طرح کا کرب انگیز Intensity of Feling ہے، تسلسل ان کی غزلوں کا غالب عنصر ہے، جدت کا دروازہ بند نہیں ہے، واردات حد درجہ نجی اور شخصی تاثر سے لبریز ہیں، تفکر کا عمق ہر شعر کیا، ہر مصرعہ اور لفظ میں موجود ہے کہ وہ الفاظ کی قیمت، ان کے جوہر، ان کی معنویت اور ان کی نشستوں سے پورے طور سے واقف ہیں۔ یہاں عبدالمجید سالک کے مطابق، زندگی کی تصویر بھی ہے اور تعبیر کے ساتھ تطہیر بھی موجود ہے۔

کم لوگوں کو واقفیت ہوگی کہ شکیب ایاز خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، پٹنہ سٹی سے دل و جان کی حد تک وابستہ ہیں اور برسوں سے وہاں کی حاضری ان کے فریضوں میں داخل ہے۔ تخلیۂ قلب اور آداب واطوار اور داخل کی طہارت وہیں سے انہیں ودیعت ہیں، نفس کی گھاٹیوں کا قطع ہونا اور قلب صفا سے ثروت مند ہونا وہیں کی دین ہیں۔ تطہیر اور لطیف معنویت سے منور ان اشعار مسلسل کو دیکھئے:

تیری خوشبو کا گہر جان پہ رکھ دیتے ہیں
ہاتھ جلتے ہوئے لوبان پہ رکھ دیتے ہیں
راہ داری سے ذرا باد بہاری گزرے
چادر گل دل ویران پہ رکھ دیتے ہیں
چمن دل پہ گزر جائے لہو کا موسم
اپنا سر ہم قد گلدان پہ رکھ دیتے ہیں
تیرے دربار کی چوکھٹ پہ قدم کس کے ہیں
فیصلہ ہم ترے ایمان پہ رکھ دیتے ہیں

یہ صوفیانہ واردات کی کیفیت، اشعار کا سنجیدہ قرینہ اور روحانی تاب یوں ہے جیسے کسی خانقاہ میں کوئی دوزانو ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی طہارت کا حق ادا کرنا بھی کار ثواب ہے۔ شاعری جب سچے جذبے اور واردات قلبی جب کسی وجود میں گھل جاتے ہیں اور فن جب تخلیقی سطح پر ثقافتی دستاویز ہو جاتا ہے اور ایک ناگزیر مظہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو معنوی اعتبار سے

بیان کے ایسے ہی کرشمے جنم لیتے ہیں۔

سچا شاعر وقت کے آگے اس طرح دیکھتا ہے کہ وہ مستقبل کا نقیب بھی کہلاتا ہے۔ شکیب ایاز کی شاعری کا یہ پہلو ان کی نمائندہ نظم 'بشارت' میں بہت واضح ہے:

مرے ارادے، بہت مصمم ہیں
کہ وہ درندہ اگر بڑھا میری تیری جانب
تو اس کی شہ رگ پہ میری نوک بھی قلم ہوگی
......دوسرے جو پیچھے آرہے ہیں
ہم بھی ہوں گے
......یہ روزنامے رقم تو ہوں گے
مضائقہ کیا جو ہم نہ ہوں گے
......وہیں پہ شاید قیام ہوگا
وہیں پہ خیمہ لگے گا اپنا
وہیں پہ سجدہ
وہیں رکوع امام ہوگا

تقسیم ہند ہمارے لئے کرب و بلا دونوں ہی تھا۔ جس نے ہماری زندگیوں میں قیامت برپا کردیا تھا کہ آج تک ہم سب خون کے آنسو روتے ہیں اور اپنا گم کردہ محور واپس لانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کئی نسلیں، کتنے ہی انقلاب، کئی زمانے آئے اور گئے لیکن وہ کرب آج بھی قائم ہے۔ آیئے دیکھیں جذباتی اور حسی سطح پر اس المیہ کا کیا تاثر ہے:

صدیوں کے امانت دار ہیں ہم اب ایسے میں ہجرت کیا کرتے
دراصل بہت گھبراتے ہیں اسلاف کے اس نیلام سے ہم

ذرا کہو تو سہی کوئے یار کیسا
مزاج شہر کا سرحد کے پار کیسا ہے

گھر جو لوٹے تو ملے غیر کے سامانوں میں
پھول کچھ چھوڑ کے آئے تھے جو گلدانوں میں

ہم پرندوں کی طرح دائمی بنجارے ہیں
شہر چھوٹے تو مقرر ہوئے ویرانوں میں

اداس کرنے والے ان اشعار کا خالق آخرش اپنے آپ سے یہ کہتا ہے ــــ کیسا بے ساختہ جدید لہجہ ہے:

آپ بھی خوب ہیں شکیب ایاز
کوئی اتنا اداس ہوتا ہے

یہاں لفظیات اور صوتی کیفیات سے جو پیکر تراشے گئے ہیں ان میں یکتائی ہے اور موضوعی جہات میں اضافے کی صورت ہیں۔ یہاں جدیدت اور عصریت مسلسل ساتھ ہیں اور ان کے باوجود ان میں Timeless Appeal ہے۔ ان کی پیشکش میں جو تہہ داری ہے اس سے ایک منفرد باطنی نظام اور تازہ لب ولہجہ فکری سطح پر نمایاں ہے۔

رشید احمد صدیقی نے کبھی کہا تھا "اردو کی وادی پرخار اپنے کانٹوں کی پیاس بجھانے کے لئے ہمیشہ کسی 'آبلہ پا' کی منتظر رہے گی۔" شکیب ایاز ویسے ہی 'آبلہ پا' جنہیں ہم 'خاصان عصر' میں شمار کرتے ہیں۔ یہ ایک شعر ایسے موقع کے لئے یاد آیا:

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا
رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں
(ادا جعفری)

رشید صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا...... بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سائے سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں...... کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو آپ کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ آپ کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں...... جہاں خاک نشینی نہ آتی ہو وہاں عرش پروازی سخت خطرہ ہے......" ہم نے شکیب ایاز کو ہر مشکل اور آسان حالتوں میں دیکھا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ مٹی پر مٹی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے شکیب ایاز جیسا ظرف چاہئے۔

اس مختصر سے تشنہ تاثراتی میں ہم نے کوشش کی ہے کہ معروضیت کے ساتھ شکیب کی بشارتوں کا احاطہ کرسکیں لیکن اگر کہیں پچھلے چالیس سالوں کی چادر پھیل گئی ہو تو یہ بھی ان کی شاعری کا کرشمہ ہی ہے کیونکہ انسانی جذبوں، رشتوں، محبتوں کا جادو بہر حال جادو ہی ہوتا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ کالا جادو نہیں ہوتا۔ ہم نے ان چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اچھی شاعری کے جو قارئین ہیں اور شکیب ایاز کو کسی حد تک جاننا چاہتے ہیں ان پر ان کا بھید کھل کر کھل اٹھے۔

برسوں کی ریاضت اور جانکاہی کے باوجود شکیب ایاز خوب سے خوب تر کی جستجو میں کوشاں ہیں اور رواں ہیں کہ شعر وادب بھی تو سیل رواں ہے۔ ان کی ریاضت فن اب نصف صدی کی حکایت ٹھہری اور وہ بھی تہذیب و تخلیق کی ساجھے داری کے ساتھ، اس لئے ان کے اشعار کو ان تناظر میں ہی دیکھنا مناسب ہوگا۔ ایاز کی شاعری میں یہ عناصر اس قدر رچے بسے اس قدر گندھے ہوئے ہیں کہ یہ کہنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ شعور تہذیب کہاں ختم ہے اور آمد تخلیق کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ بہتے ہوئے پانی سے لہروں کو کیوں کر جدا کر سکتے ہیں؟

پٹنہ میں محبت و یگانگت کا ماحول گویا ختم ہو چکا ہے کہ اب تو یہ راون کی لنکا ہے کہ رائی بھی کہتی ہے کہ ہم پربت ہیں لیکن ایسے تاریک دشت بے پناہ میں بھی شکیب جیسے چند ایک چراغ روشن ہیں اور اس طرح روشن ہیں کہ نہ ان کی ہمت ٹوٹتی ہے نہ دل پھرتا ہے۔ یہ تبسم زیر لب ایسے احباب جو Microscopic Minority کہے جائیں گے اپنا وہ کام کئے جا رہے ہیں جنہیں ادبی تاریخ کبھی نظر انداز نہ کر پائے گی۔

میں شکیب سے جتنا قریب ہوتا گیا میرے پیار اور تکریم کے جذبے فزوں تر ہوتے گئے، اور ان کی شاعری میرے لئے پرفسوں ہوتی چلی گئی۔ مزید قریب ہوئے تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اخلاق، ایثار، قناعت اور انکسار خودداری کا بے عدیل مجموعہ ہے۔ ہر ملاقات کے بعد وہ میرے لئے مزید پرکشش ہو گئے۔

شام کو شکیب ایاز اکثر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اکثر میرے ذہن سے یہ بات اتر جاتی ہے اور میں فون کر بیٹھتا ہوں تو وہی بات کہ باہر ہیں لیکن وضعداری کا یہ عالم کہ واپس لوٹے معلوم ہوا کہ ہم نے فون کیا تھا تو فوراً جوابی فون آتا ہے —— "شفیع بھائی......" میں ہنس پڑتا ہوں۔ "کوئی بات نہیں، تم سے بات کرنے کی لت لگ گئی ہے۔" ایسے ہی میں ایک دن ہم نے پوچھا "شام کو نکلتے ہو تو کیا اب بھی پھولوں کا ہار لے کر جاتے ہو؟" جواب ملا۔ "اب وہ دور تو گیا، اب تو ہار لے کر گھر آتے ہیں۔" اس مختصر سے جملے میں پورا ایک دور گزر جاتا ہے۔ ایک کلچر، ایک زمانہ، جو تھا، پر اب نہیں ہے۔

ادب شکیب ایاز کے لئے مراقبے کا درجہ رکھتا ہے اور اشعار کہنے میں نظم وضبط کا یہ عالم کہ

گویا خانقاہ عمادیہ میں وہ زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ پریشانیاں اور محرومیاں ان کے دامن سے نہیں لپٹیں لیکن میں نے کبھی ان کے چہرہ پر اس کا کوئی اثر نہ دیکھا، گلے شکوے ان سے ہمیشہ دور رہے، شگفتگی نے انہیں ہمیشہ روشن رکھا۔ ان سے ہر ملاقات سہل اور گفتگو خوشگوار تر، یک بیک نہیں کھلتے، آہستہ آہستہ کھلتے ہیں، جیسے کوئی کلی کھلتی ہے، چپکے چپکے، آہستہ آہستہ، باتوں کا نرم اور خنک انداز، اکثر ساتھ چلنے کا اتفاق ہوا تو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ راستہ میں زندگی طئے کر رہا ہوں اور اکثر جی چاہا کہ عمر رفتہ کو آواز دی جائے کہ ایسے میں زندگی کثرت نظارہ چاہتی ہے۔

شکیب ایاز کے شعری محاسن پر قبل کئی باتیں آچکی ہیں، پھر بھی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کے اشعار نیزوں کی طرح بلند نہیں ہوتے، بلکہ قطرہ قطرہ دلوں کے تحت الثریٰ میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا اصل حوالہ درد ہے، جو مختلف صورتوں میں ان کے تخلیقی سفر میں ساتھ ساتھ چلتا ہے اور یہ حقیقت بھی نمایاں ہی نہیں بلکہ حاوی ہے کہ ان کی شاعری روایات کی پوری میراث کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتی ہے۔ ان کے اشعار کے سجاؤ اور بہاؤ دونوں کی ایسی فضا ہے جو منفرد ہوتے ہوئے بھی دل کے پاس لگتی ہے جیسے ان میں ہمارے ہی دل کی دھڑکن شامل ہو کہ ان میں پروئے ہوئے جذبات یا تو ہم سے ہو کر وہاں تک جاتے ہیں یا وہاں سے ہو کر ہم تک آتے ہیں، ہر وہ جس نے دل کے نہاں خانوں میں تخیل کے جگنو سجائے ہیں، جس نے کائنات کی جمالیات کے مختلف پہلوؤں پر فکر کیا ہے، جس نے کچھ کھو دینے کے تاسف کا ذائقہ چکھا ہے، اس کے لئے ان اشعار کے سجاؤ اور بہاؤ اپنے ہیں۔ سچی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے۔ اسے شاعری کی ہمنوائی بھی کہتے ہیں جو ایسے اشعار کی معنویت سے ہی ابھرتے چلے آتے ہیں۔ اشعار کے فنی مطالبات پر ایاز کی طرح کم لوگوں نے دھیان دیا ہوگا۔ ایاز ''اہل توکل'' میں سے ہیں آکاش وانی (آل انڈیا ریڈیو) کی نوکری کو اس طرح چھوڑ آئے جیسے کوئی اپنے جسم سے ناپسند کپڑا اتار دیتا ہے اور ادب و تعلم کو اس طرح گلے لگایا جیسے کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو۔ ہم نے اونچی آواز میں شکیب کو گفتگو کرتے کبھی نہیں سنا ہے۔ یہ بھی درویش صفتی ہی ہے۔ وہ دنیا میں رہتے ضرور ہیں لیکن دنیا داری کم کم آتی ہے:

ذوق اس بحر فنا میں کشتی عمر رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

✠✠✠

برف آشنا پرندے: ایک جائزہ

علی احمد فاطمی

ناول کو زندگی کا رزمیہ کہا گیا ہے۔ اب یہ رزمیہ کیا ہے اس مسئلہ یا فلسفہ پر جتنی بحث کی جائے گی اتنی ہی پیچیدہ ہوتی جائے گی۔ اس پیچیدگی وژولیدگی کے بطن سے ایک کتاب بھی وجود میں آ جائے گی اور آتی رہی ہے لیکن کتاب کے بارے میں کسی نے حیران کن بات کہی ہے کہ اس میں شامل علم دوسرے یا تیسرے درجہ کا ہوتا ہے شاید اس لئے کہ کتاب لکھنا نسبتاً آسان ہے اور زندگی کی رزم گاہ کو کھلی آنکھوں سے اندھیرے میں دن کی روشنی کی طرح دیکھنا بیحد مشکل کام ہوا کرتا ہے شاید اسی لئے کسی اور نے بیحد بلیغ بات کہی ہے کہ فلسفی بننا آسان ہے لیکن چھوٹے چھوٹے خیال کو جذبے کی آنچ میں ڈھال کر پر تاثیر اور معنی خیز تخلیق میں ڈھالنا بہت دشوار ہے۔ انسانی وزمینی سچائیوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ فلسفہ بہر حال فلسفہ ہے جسے کسی طرح زندگی کے تجربات ومشاہدات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ ان سب واقعات کا عطر اور نچوڑ ہوتا ہے تبھی تو ناول کے حوالے سے ڈی ایچ لارنس نے کہا تھا کہ فکشن کا فلسفہ بن جانا اس کا نقطہ عروج ہے۔ فلسفہ ایک وحدتی عمل ہے اور زندگی ایک انتشاری عمل۔ بکھراؤ کو سمیٹنا اور ایک لڑی میں پرو کر فلسفہ وحدت میں ڈھالنا بہر حال ایک بیحد مشکل اور پیچیدہ کام ہوا کرتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اردو میں اور میرے خیال میں دنیا کے بڑے بڑے ناولوں کا یہی امتیاز رہا ہے کہ وہ انتشار میں اتحاد اور اضطراب میں انبساط کی کیفیت سے دو چار کرتے ہیں۔ فکر وفن

سے متعلق یہ تضاد دراصل زندگی کا ہی تضاد ہے جو بہت سی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتا رہا ہے اور نئی نئی گتھیوں کو بھی پیش کرتا رہا ہے۔ پرانی حقیقتوں کو پیش کرتا ہے اور ان کے درمیان سے نئی حقیقتیں دریافت بھی کرتا رہا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے تخلیق کی یہی معراج ہوا کرتی ہے کہ وہ نو بہ نو حقیقتوں کو دریافت کرے اور ایک نئے فلسفہ حقیقت کی تعمیر کرے۔ ناول اور حقیقت کے رشتے پر بہت پہلے رال فاکس نے اچھی بات کہی تھی:-

> "یہ فرد کی معاشرہ اور فطرت کے خلاف عظیم جدو جہد اور کشمکش کی داستان ہے اور یہ ایسے ہی معاشرہ میں پنپ سکتا ہے اور پروان چڑھ سکتا ہے جہاں انسان اور سماج، فرد اور معاشرہ میں توازن کا فقدان ہو۔ جہاں انسان اپنے ساتھ انسانوں سے یا پھر فطرت سے نبرد آزما ہو۔"

ان کچے پکے خیالات کی روشنی میں اگر میں ترنم ریاض کے تازہ ناول "برف آشنا پرندے" کے بارے میں اپنے محض کچے خیالات پیش کروں تو بات بہت معتبر نہ ہوگی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ بے اعتباری اور لاچاری اور کمال وزوال ہی زندگی کا رزمیہ ہے اور المیہ بھی اور ساتھ ہی ناول کا موضوع بھی۔ ایک غیر ضروری بات اور کہتا چلوں کہ دنیائے تنقید بھی ایک چھوٹی موٹی رزم گاہ ہے۔ وہ لوگ جو کتابوں کے حوالوں سے زندگی کو سیکھتے ہیں ان کی تنقید خلا کی بے نام کھونٹی سے ٹنگی رہتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو دنیا کے حوالوں سے کتابوں کو دیکھتے ہیں ان کی تفہیم و تعلیم میں خواہ ہزار کمزوری ہو، لیکن زندگی سے ان کا رشتہ بہر حال مضبوط ہوتا ہے۔ میں ایک ادنیٰ قاری ہونے کے باوجود اپنے آپ کو دوسری صف میں کھڑا پاتا ہوں۔

"برف آشنا پرندے" ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی خوبصورت و معنی خیز داستان ہے۔ خاندان کے کئی گوشوں، پشتوں سے ہوتی ہوئی کشمیری زبان وتہذیب کی راہوں سے گزرتی ہوئی کہانی پہلے ذہین الدین اور رندہت پر آٹکتی ہے۔ شوہر اور بیوی کے درمیان روایتی اختلافات، شوہر کی برہمی اور زیادتی، بیوی کا صبر اور مظلومی۔ ان سب کا اثر اولادوں پر۔ عاصم کا بھٹک جانا، ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول عاصم کے بھٹکے ہوئے کردار کو رخ دے گا اور موجودہ سماجی بھٹکاؤ اور دہشت گردی وغیرہ سے رشتے استوار کرے گا لیکن ناول شیبا کی راہ پر چل پڑتا ہے جو آگے بڑھ کر مرکزی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ شیبا —— نجم خاں اور ثریا بیگم کی بیٹی، لیکن شیبا سے قبل والدین اور خاندان کی طویل داستان عروج و زوال کے سلسلے سامنے آتے ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے زوال کیوں کہا جائے بدلاؤ کیوں نہیں

کہ تبدیلی ایک فطری عمل ہے اور ارتقائی بھی۔ کشمیر ہی کے پس منظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ شاخ پر پھول کھلتے ہیں، مرجھاتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں، پھر اسی شاخ میں دوسرے پھول کھلتے ہیں۔ اقبال نے بھی کہا تھا:

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے　　　اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

لیکن مشکل یہ ہے کہ پھول اور انسان میں فرق ہے۔ انسانی نسلیں اپنے ارتقاء میں تہذیب وثقافت اور معاشرت کو بھی متاثر کرتی ہیں اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیتی ہیں جسے پرانی نسل عموماً زوال سے بھی تعبیر کرتی ہے۔ معاشی اور اقتصادی ترقیاں وتبدیلیاں انسان کی جذباتیت اور رشتوں کی حساسیت کو بھی متاثر کرتی ہیں اور نئی نئی شکلیں سامنے آتی ہیں جو قدیم عناصر پر قدغن لگاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ گردش لیل ونہار، وقت کا سفاکانہ اظہار، تہذیبوں کے پیکار، زندگی کے آزار پھر آثار اور پھر حساس انسان اور فنکار —— شیبا کا کردار —— کشاکش اور کشمکش تو ہوگی اور ہونی بھی چاہئے کہ یہی کشمکش ہی زندگی کی دلیل ہے۔ ایک طرف والدین، قدیم گھر اور گھریلو تہذیب اور آگے بڑھ کر یونیورسٹی کی تعلیم اور پروفیسر دانش —— سب کچھ رفتار زندگی کے ساتھ ایک کڑی میں جڑے چلے جاتے ہیں۔ وہ کڑی جو بظاہر بکھری بکھری سی ہے لیکن بامقصد فن اور فنکار اس بکھراؤ اور انتشار میں اتحاد کی شکلیں بناتا چلتا ہے۔ بڑے اور ضخیم اور غیر رومانی ناولوں کے معاملات ومطالبات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ ''آگ کا دریا'' سے لے کر ''کئی چاند تھے سرآسماں''۔ یہ ناول ''برف آشنا پرندے'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پروفیسر دانش جو ایک شہرت یافتہ سماجیات کے پروفیسر ہیں، انگلش یا اردو کے بھی ہو سکتے تھے لیکن سماجیات کا پروفیسر ہونا معنی خیز ہے کہ ان کی نگرانی اور سرپرستی میں آج کے سماج کو سمجھا جاسکتا ہے۔ شیبا جو گھر کی محبت، روایت، شادی، حتیٰ کہ ملازمت وغیرہ سے بے پرواہ ہوکر سماجیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اچانک پروفیسر پر فالج کا حملہ ہوجاتا ہے۔ پروفیسر پر فالج دراصل ایک فرد پر فالج نہیں ہے بلکہ علم ودانش پر ہے، پورے سماج پر ہے —— اسی سماج پر جس کے بارے میں بڑی جرات کے ساتھ شیبا سوچتی ہے:

''نئے نئے چیلنجز کا سامنا ہے سماج کو —— ہماری جنریشن کو۔ عجیب سے کنفیوژن میں گھری ہے جیسے ساری دنیا —— یہ گلوبائزیشن، یہ بے شمار کلچرس کو ایک ہی تہذیب میں بدلنے کی شعوری کوششیں۔ یہ سپر پاورس کی انسان دشمنی

......یہ نیو کلائی طاقتوں کا بڑھتا ہوا زور اور بڑی طاقتوں سے بھی بڑے سرمایہ کاروں کا دباؤ ـــــ کہاں جا رہی ہے یہ مخلوق اشرف ـــــ ہماری نسل کو کچھ کرنا ہوگا ورنہ جانے کیا انجام ہوگا اس حرص و ہوس کا......"

آج کے سماج کی بڑھتی ہوئی صارفیت، حرص و ہوس نے گھر کی تہذیب کو ہی نہیں تعلیم و تدریس کو بھی منقلب کر دیا ہے۔ شیبا کا کردار گھر اور کالج، والدین اور استاد، مرد اور عورت اور قدیم و جدید کے درمیان پھنسا ہوا ایک ایسا احساس و سنجیدہ کردار ہے جو بے شمار انسانوں کی علامت بن کر ابھرتا ہے جو ہر اعتبار سے والدین سے زیادہ استاد کی خدمت کر کے علم و دانش کو بچانا چاہتا ہے کیونکہ والدین سے محبت ہے تو استاد سے عقیدت اور یہ بلاغت بھی کہ دانش کا تحفظ سب سے زیادہ ضروری ہے لیکن وہ اکیلی ہے، بھائی بہن ساتھ نہیں، یار دوست بس یونہی سے البتہ کہیں ملازم اور کہیں اس کا اپنا عزم، لیکن وہ ضرورت سے زیادہ اور جذباتی ہے۔ یونیورسٹی میں رہتے ہوئے گھر کی یاد اور فکر اور گھر میں رہتے ہوئے پروفیسر کا خیال۔ اکثر وہ ناسٹلجیا کا شکار ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس حد تک کہ اس کے لبوں سے آہ تک نکل جاتی ہے لیکن یہ آہ صرف اس کی اپنی آہ نہیں بلکہ پورے ایک دور، ایک تہذیب کی یاد بلکہ کہیں کہیں فریاد بھی بن جاتی ہے۔ فریاد کے پیچھے زوال ہے، جو ماضی اور حال، رشتے علاقے وغیرہ کا جال بن کر ایک داستان کرب مرتب کر رہی تھی۔ ادھر شیبا کے والد اپنے ماضی میں کھوئے ہوئے کہتے تھے کہ شیبا کی شادی کے بعد گاؤں چلے جائیں گے کہ وہیں کی مٹی میں دفن ہونا ہے لیکن شیبا کی شادی نہ ہو سکی کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم کی خواہاں ہے۔ اعلیٰ تعلیم محض ڈگری نہیں بلکہ اعلیٰ اقدار، اپنی ذات سے زیادہ کائنات کے سلسلے لیکن ذات گھر سے دور ہوسٹل کے کمرے میں بند۔ باپ قصبہ کی حویلی میں قید، گاؤں نہ جا پانے کی کسک، ساری خواہشات، سارا نظام الٹ پلٹ، دل کے تقاضے کچھ اور، زندگی کے تقاضے کچھ اور، نئی نسل کے مطالبات کچھ اور، سماج کی بدلتی ہوئی صورت اور صارفیت کچھ اور۔ ناول میں اس کشمکش اور کسک، فطرت اور غیر فطرت کی تکرار کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک منظر یہ دیکھئے:

"چند دن گرمیوں کی چھٹیاں جو اپنی زمینوں میں اپنے غم زادوں کے ساتھ تقریباً اپنی مرضی کے مطابق گزارا کرتی تھیں۔ شیبا کے ذہن کو جیسے پک رہے اخروٹوں کے پختہ ہو رہے چھلکوں اور اخروٹ کے پتوں کی سحر آگیں مہک نے معطر کر دیا۔ آنکھوں میں گل لالہ کے خودرو پھول گھوم گئے جنہیں کھیتوں کے کناروں

پراگ جانے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ بنگلے کا عقبی باغیچہ یاد آ گیا، جہاں گیندے کے پھولوں کی بہتات سے ہر وقت ایک بھینا بھینا طلسمی ماحول رہتا تھا۔ سب بچوں سے چھپ کر کبھی کبھار تنہا کیاری کیاری گھومنا یا مشرقی کونے میں آلو بخارے کے درخت کے تنے کے پاس بچھی پتھر کی بڑی سل پر بیٹھنا کیسا سرور دیتا تھا جیسے ساری کائنات اپنی ہو۔"

یا یہ جملہ —— "شہری کی عدالت میں گاؤں کی زمین کا مقدمہ نہیں لڑا جا سکتا۔" یہ محض ایک جملہ نہیں یا قدم قدم پر بکھرے ایسے درجنوں جملے معیشت اور معاشرت کے ایسے تاریخی اشارے وحوالے ہیں جو تاریخ کے مضمون میں بھی نہیں ملتے۔ تخلیقی ادب کی تاریخ وتہذیب میں معتبر و موثر انداز میں چھلکے پڑتے ہیں۔ اسی لئے بعض دانشوروں کا یہ کہنا درست ہے کہ سب سے عمدہ و معتبر تاریخ ادب میں ہوا کرتی ہے جس میں ماضی اور حال کا ایک جہان نظر آتا ہے اور پھر ایک جہان معنی بھی جو رومانیت کی راہ سے حقیقت تک اپنا سفر طے کرتا ہے کبھی کبھی اس کے برعکس بھی۔ باپ جب تک زندہ تھے، صحتمند تھے، وطن کا راستہ گلابوں سے پر تھا لیکن زمین جائیداد کا مقدمہ، خرابی صحت، بیماری و آزاری اور پھر جدائی۔ وہی راستہ اب کانٹوں سے بھرا ہے۔ کشمیر کے پس منظر میں گلاب سے کانٹوں تک کا یہ سفر۔ ماضی وحال، سوال در سوال، حال سے بے حال اور پھر یہ خیال:

"وہ کسی ایسے مقام پر چلی جائے جہاں اسے ایسے مناظر کبھی نظر نہ آئیں اور کوئی اس سے بات کرنے کو موجود نہ ہو۔ جنگلوں یا غیر آباد زمینوں میں، ویرانوں یا قبرستانوں میں۔"

شہر کی بے ہنگم، بے مقصد اور بے مروت ہنگامیت۔ تہذیب وعلم کی علالت اور صدیوں کے تہذیبی اور سماجی سفر کی ترقی کہ وہ ویرانے اور غار سے نکل کر شہر آئے یا شہر بسائے۔ آج کا حساس اور سنجیدہ انسان پھر ایک بار شہر چھوڑ کر گاؤں یا ویرانے میں جانے کی خواہش رکھے۔ رشتوں کے تعلق سے بطور خاص مرد اور عورت کے رشتے، میاں بیوی کے رشتے، باپ بیٹی کے رشتے، استاد شاگرد کے رشتے، حالات وحادثات رشتہ توڑنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ شکست و ریخت، یہ ٹوٹن قاری کو بھی توڑتی ہے اور مصنفہ کو بھی۔ ترنم ریاض کی کہانیاں ہوں یا ناول ان میں رشتوں کی نزاکت، حقیقت، جہت اور تازہ کاری عجیب وغریب شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ رشتے ٹوٹتے ہیں، بکھرتے ہیں اور پھر نئی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس عمل کا نقطہ عروج وہاں

نظر آتا ہے جب ان کرداروں سے بھی بے نام رشتے بن جاتے ہیں جن سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اٹوٹ رشتوں کا بکھراؤ اور بے نام رشتوں کا جڑاؤ جیسے اس دور کا مقدر ہے۔ یہاں اگر ایک طرف قدیم طرز کا ناسٹلجیا نظر آتا ہے تو ایک نیا ناسٹلجیا جنم بھی لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیبا کا کردار کہیں کہیں وقت کے ہاتھوں یا احساس کے ہاتھوں کٹھ پتلی سا بن جاتا ہے کہ اچانک اسی کے توسط سے اس کے والدین کی دلدوز تصویر ابھرتی ہے۔ شیبا کو محض شہر چھوڑنے کا غم ہے تو اس کی ماں کو ایک جہان غم ہے۔ شوہر کی وفات، بیٹیوں کی رخصت، گھر میں ویرانی وتنہائی۔ یہ جملے ملاحظہ کیجئے:

> ''کوئی نہیں رہتا ہے اب یہاں —— یہاں بڑا سناٹا ہے'' انہوں نے چیخ کر کہا اور دھاڑیں مار کر رو دیں کہ کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ انہیں نجم خاں کی بیحد یاد آرہی تھی۔ انہیں بچے یاد آرہے تھے۔ انہیں بچوں کے بچپن میں پہنے کپڑے بہت یاد آرہے تھے —— اب وہ نایاب لمحے کبھی نہیں آئیں گے اور اب بچوں کی اپنی دنیائیں ہیں۔ اب گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ خود ثریا بیگم بھی نہیں رہتیں۔ اب ثریا بیگم کی شکل سے ملتی ایک ادھیڑ عورت چلتی نظر آتی ہے۔''

یا یہ جملہ —— ''مگر اب وہ گھر میں نہیں رہتیں۔ وہ گھر میں صرف نظر آتی ہیں۔'' شیبا کے پاس ہوسٹل کی زندگی ہے۔ سیمینار کانفرنس ہے۔ مصروفیات ہیں لیکن ثریا بیگم کے پاس صرف جدائی ہے تنہائی ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو مرکزی کردار کے حوالے سے جزوی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اکثر اپنی اثر پذیری اور جذباتی کیفیت سے تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کرداروں کی عظمت اور کردار نگاری کی صفت اکثر کردار کی کشمکش سے وابستہ رہتی ہے۔ یہ کشمکش مختلف نوع کے رشتوں کی تو ہوتی ہے، گزرے ہوئے واقعات، ماضی اور حال کی بھی ہوتی ہے۔ پرانی اور نئی نسل کے درمیان ہوتی ہے، پستی ہے اکثر ماں، دونسلوں اور کئی طرح کے رشتوں کے درمیان۔ لیکن یہ کشمکش، یہ پسنا، یہ گھسنا اور پھر رنگ لانا، کسی شاعر نے کہا تھا:

> کشمکش عظمت کردار عطا کرتی ہے
> زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

اسی بے عافیتی کو ہی دوسری زبان میں ''رزم گاہ'' کہا گیا ہے۔ جہاں چھوٹے چھوٹے کردار بھی اپنا اہم رول ادا کرتے ہیں جیسے اس ناول میں بابا صاحب، راحت علی خاں وغیرہ کا کردار، کچھ اور کردار، کچھ اور قصے جو بظاہر بے ترتیب اور الگ تھلگ سے لگتے ہیں اور کبھی کبھی لگتا ہے کہ ناول بیجا طوالت کا شکار ہو رہا ہے لیکن باطنی طور پر وہ ناول کسی ساخت اور مرکزی خیال

کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ایسے واقعات اور کرداروں کو ساخت اور بافت کا حصہ بنانا اور اسے نفس واقعہ اور معنوی نظام کا بھی حصہ بنا دینا اپنے آپ میں کمال اور جمال دونوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ترنم ریاض کو اس مقام پر بھی خاصی کامیابی ملتی ہے۔ جہاں جہاں وہ بے ربطی و بے ترتیبی محسوس کرتی ہیں منظروں، پرندوں سے رنگ بھر کے اسے ایک اور نیا رنگ دے دیتی ہیں۔

چھٹے باب تک ناول گھریلو کشمکش اور تہذیبی عروج وزوال کا رزمیہ بن کا چلتا ہے لیکن طربیہ انداز میں، ایک نئے مناظراتی پیشکش کے ساتھ لیکن ساتویں باب سے ناول کروٹ لیتا ہے اور کشمیر کی سیاست ابھرتی ہے۔ خاصے طویل پیرائے میں کشمیر کی تاریخ وتہذیب کو پیش کیا گیا ہے جو قدرے غیر ضروری سا لگتا ہے کہ ناول کا اصل موضوع تو کچھ اور ہی ہے تاہم بڑے اور ضخیم ناولوں میں تاریخ کے پارے جانے انجانے انداز میں داخل ہو ہی جاتے ہیں کہ ناول کی وسیع القلبی بڑی بڑی چیزیں ہضم کر لیتی ہے تبھی تو ورجینا وولف نے کہا تھا کہ ناول ایک ایسا شتر مرغ ہے جو ہر چیز کو ہضم کر لیتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ترنم ریاض نے سوال اٹھائے ہیں —— ''کہ صرف کشمیر ہی دنیا کی بربادی کا ذمہ دار کیوں ہے؟'' ایک طرف گھریلو معاملات، جذباتی حادثات، دوسری طرف صوبہ کے سیاسی حالات اور ملک کے حادثات، حکومت کی زیادتی، دہشت گردی، درمیان میں شیبا کا حساس اور سوچتا ہوا کردار، کبھی کبھی تو شیبا میں ترنم ریاض اور ترنم ریاض میں شیبا مدغم نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں جذباتی اور کہیں معروضی انداز میں سوچتا ہوا ذہن۔ اس ملی جلی کیفیت کو مصنفہ نے بڑے دلچسپ انداز میں کچھ یوں پیش کیا ہے:

> ''اس روز دھوپ سارا دن چمکتی رہی تھی۔ بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کے راستے میں نہیں آیا تھا۔ برف چھتوں سے درختوں کی سوکھی ٹہنیوں اور خزاں زدہ پودوں سے پگھل پگھل کر قطرے بن رہی تھی۔ ہوا بہت تیز چلتی تو قطرہ تصویروں میں بننے والے قطرے کی الٹی شکل میں ٹنگا رہ جاتا مگر دھوپ کی تیزی آخر اس قطرے کو پگھلنے پر مجبور کر دیتی۔''

ان تمام بڑے حالات کے باوجود شیبا کی ذاتی زندگی میں ایک ہلکا سا موڑ آتا ہے یا لایا جاتا ہے۔ سنجیدہ حساس پڑھنے لکھنے والی شیبا جو شادی سے بہت دور رہنا چاہتی ہے، جو راحت اور زین الدین جیسے مردوں کو سخت ناپسند کرتی ہے کہ اچانک اس کی زندگی میں رومان ابھرتا ہے۔ عشق، جذبۂ عشق، ہر دور، ہر مقام پر اپنے بال و پر کھولتا ہے اور پرواز کرتا ہے جس سے رویہ بدل جاتا ہے اور لہجہ بھی۔ اب رومان سے پُر یہ جملے دیکھئے:

"سیاہ گہری کچی کچی آنکھوں کو ایک بار جی بھر کے دیکھنے کی تمنا میں اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ کھلے بالوں کو عارضی جوڑے میں موڑ کر وہ برآمدے میں آ گئی۔ گہرے رنگ کی نیلی روشنی سے صبح طلسمی سی معلوم ہو رہی تھی۔ بہت سے پرندے ابھی سو رہے تھے۔ دور کوئی چڑیا سیٹی بجاتی چہکتی تھی۔ بادِ صبا نے اس کے گریبان پر لگی بہت سی چنٹوں والی سفید جھالر اس کے داہنے رخسار کی جانب اڑائی اور کئی سیکنڈوں وہیں چھوڑ دی۔ شیبا نے جھالر کا نرم لمس محسوس کر کے لمحے بھر کے لئے آنکھیں میچ کر ہوا کا شکریہ ادا کیا۔"

کچھ نئے کردار، نئے واقعات ناول میں نئے موڑ لاتے ہیں۔ ناول کو طویل کرنے کے لئے ایسا ضروری بھی تھا لیکن شیبا کو یہاں بھی ناکامی اور مایوسی ہاتھ آتی ہے اور پھر وہ کئی معاملوں، فلسفوں میں الجھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر دانش، خدا کا وجود، سیمینار، کانفرنس، علی گڑھ، دہلی اور دانشورانہ باتیں، رشتوں کی نزاکت، یہ سب تو ٹھیک لیکن کہیں کہیں لگتا ہے کہ ناول میں بھٹکاؤ آ گئے ہیں۔ تخلیقیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ ناول واپس گھر کی طرف آتا ہے تو ایک نئے مسئلے کے ساتھ۔ آزاد خیالی اور دانشوری وہ بھی ہندوستانی معاشرہ میں، جہاں روایات، رسم و رواج، عورتوں کا ایک خاص قدیمی و مشرقی مزاج، سہیلی میوری کی آمد، نیل کے تذکرے، مصر کی تاریخ پھر تازہ ترین اقتداری سیاست اور فرعونی طاقت کے ذریعہ مصر کی، بغداد کی تاریخوں کا مٹ جانا یا ارادی و شعوری طور پر مٹا دیا جانا، تاریخ و تہذیب کے طلبا، حیرانی و پریشانی، سوال در سوال:

"جب یہ حملے شروع ہوئے تھے تو ان لوگوں کو یقین ہی نہ آیا تھا کہ واقعی ایسا ہو رہا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں۔ طلباء حیران ہو کر دانش سر سے سوال پہ سوال کیا کرتے تھے۔ سر اداس سے جواب دیتے۔ شیبا کے تو سوال ہی ختم نہیں ہوتے تھے پھر وہ سوچتی رہ جاتی جیسے اس کا کوئی ذاتی غم ہو۔"

ساری دنیا کا علم اور انسانیت پریشان، شیبا بھی پریشان، اب اس کا غم افرادِ خانہ سے نکل کر دنیا کے افراد، دنیا کی تباہی، تہذیب کے مسمار ہونے کا غم، یہ ایک طرف لیکن دوسری طرف ——

"مگر دوسرے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جوان سب سے بے تعلق ہمیشہ کی طرح اپنی زندگی میں مگن تھے۔"

یہ ہمیشہ ہوتا ہے جو جہاں کا غم رکھتے ہیں، انسانی تہذیب سے پیار کرتے ہیں ان کا غم دوسرا ہوتا ہے، وہ اسی طرح سوچتے ہیں —— "پرانے شہر تو انسان کا اصل ورثہ ہوتے ہیں انہیں سنبھال

کر رکھنا چاہئے انسان کو۔" بڑے غم چھوٹے غم کو بھلا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ معمولی عشق کا الہڑ جذبہ بھی سرد پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیبا کے دل میں رومان کی لہریں اٹھتیں تو انسانیت کی بربادی کے آگے وہ کچھ نہ سوچ پاتی۔ میوری نیل کی خوبصورت آنکھیں بھی بھول جاتی ہے۔ انسانی طاقت اور ناطاقتی کی سرد جنگ، اقتدار کی سیاست، مال و دولت کا برہنہ کھیل، زندگی کا معمہ اور پھر فلسفہ، پھر سوالات، ایک سوچتا ہوا مصنف ایسے ہی سوالات قائم کرتا ہے:

دیکھو کیسا لگ رہا ہے زندگی میں
دیکھئے کیسے عجیب معاملے ہیں زندگی میں
کیا زندگی کے احتجاج کی بنیاد بے سکونی سے شروع ہوتی ہے؟

لیکن یہ سارے سوالات انسان ہی قائم کرتا ہے اور انسان ہی ان کے جوابات بھی تلاش کرتا ہے کیونکہ تعمیری سوچ رکھنے والوں کے یہاں امید وامکان کے جذبات وتصورات ہوتے ہیں، اسی لئے ایسے جملے بھی نکلتے ہیں:

"کچھ نہیں! سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بوڑھا نوکر بھی اپنے انداز میں کہتا ہے:

"زندگی اللہ کی نعمت ہے۔ جب تک ہے اس کا احترام انسان پر فرض ہے۔"

باپ کی موت، استاد کی موت، شیبا کچھ فیصلے کرتی ہے اور زندگی کی یاسیت کو کم کرتی ہے کہ زندگی رواں دواں ہے، جاوداں ہے اور ہر دم جواں ہے۔ غم زدگی، مفلسی چاند میں دوئی دیکھتی ہے اور خوشی میں چاند میں محبوب کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور شیبا کا یہ فیصلہ کہ اب اپنے وطن جاؤں گی اور امی کے ساتھ رہوں گی اور امی ہی آگے سوچیں گی۔ شیبا کے اس فیصلے پر بحث ہو سکتی ہے کہ ان میں شکست کا عنصر جھلکتا ہے پناہ اور فرار کا بھی اور یہ بلیغ اشارہ بھی کہ فیصلہ قدیم بود وباش کے حق میں جاتا ہے۔ ماں کے حق میں یا دھرتی ماں کے حق میں بھی۔ کئی زاویے، اتفاق اور اختلاف کی منزلیں بھی۔

اس ناول کے سب سے خوبصورت تخلیقیت سے پُر وہ حصے ہیں جہاں ترنم ریاض زندگی کے سرد وگرم، خوشی اور غم کو موسموں، پھولوں اور پرندوں کے حوالے سے پیش کرتی ہیں کہ گھاس پھوس میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ کردار اور منظر گھل مل گئے ہیں۔ مثلاً:

"سورج ڈھلنے والا تھا کہ کرنیں صرف سفیدے کے درختوں کی چوٹیوں پر جا رکی تھیں۔ پرندے چھوٹی چھوٹی اڑانیں بھر کر کسی جگہ بیٹھ جاتے تھے۔ خوبانی

کے درخت پر بیٹھی ایک منیا چھپی ہوئی تیز آواز میں مسلسل چہک رہی تھی۔"

"روشن دان کے ست رنگے شیشوں میں رنگ برنگی روشنیاں کھانے کی لمبی میز سے کنارے سے ہوتی ہوئی قالین پر پھیل گئی تھیں۔ سبز قالین کے درمیان نیلے دائرے میں بنے زرد پھول نیلی روشنی کی زد میں آنے سے ہرے نظر آرہے تھے اور نیلے دائرے کو سرخ کانچ سے چھن کر آ رہی روشنی نے لاجوردی رنگ میں رنگ دیا تھا۔"

مناظر سے تخلیقی فضا سنورنے کے ساتھ ساتھ جو فکر انگیز اشارے ملتے تھے اس سے ناول کے فکری ارتقا اور تخلیقی وجدان میں غیر معمولی اضافے ہوتے ہیں اور قرات محض منظر کی لطف اندوزی تک محدود نہیں رہتی قاری ان سے اوپر اٹھ کر وابستگی اور ہم رشتگی کے ایک ایسے ڈور میں بندھتا چلا جاتا ہے جو معنی کو بھی اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ ترنم ریاض فطرت کے حوالوں کے بغیر دو قدم آگے نہیں بڑھتیں اور کبھی کبھی تو فطرت میں انسانی فطرت کچھ اس انداز سے جذب کر دیتی ہیں کہ معنی و مفہوم دوآتشہ ہو جاتے ہیں۔ ایک منظر یہ دیکھئے:

"باجی نے گہرے گلابی رنگ کے کشمیری ریشم کا شلوار پہن رکھا تھا۔ ابو کا جواب سن کر شیبا کی پر سکون نظریں باجی کے قمیص کے دامن پر ٹھہر گئیں۔ ریشم کے معصوم کیڑے اپنے گرد خول ہی خول بُن کر اس میں قید ہو کر اپنا دم گھونٹ لیتے ہیں۔ اس خول کے تاروں سے ریشم نکلتی ہے۔ خالی خالی سا پیڑ، پیڑ نہیں مکڑی لگتا ہے۔"

یہ محض منظر نگاری یا فطرت نگاری پر تبصرہ نہیں ہے بلکہ اس عہد اور ماحول کے سماجی نظام پر بھی تبصرہ ہے جو فطرت کے خلاف جاتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس منظر کشی یا فطرت نگاری کا براہ راست تعلق کردار کی نفسیات سے تو ہے ہی ناول کے پلاٹ یا اس سے زیادہ مرکزی فکر سے ہے۔ ناول محض قصہ نگاری نہیں بلکہ فطرت کے پیچ وخم اور انسانی کیف وکم کو مفکرانہ وفنکارانہ انداز سے پیش کرنے کا عمل زیادہ ہے۔ خاص طور پر نئے ناول کی نئی دنیا کچھ اس طرح کے راستے اختیار کرنے پر مجبور ہے کیوں کہ اس کا قلم اور اس کا ذہن ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ زمانہ اور معاشرہ جو انسانی حرکت وعمل کی آماجگاہ ہوتے ہیں، جہاں سے فکر وفن کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ چرند، پرند، پھل پھول، موسم و ماحول، چائے کی پیالی حتیٰ کہ فکر انگیز کتابوں میں بھی یہ سب کے سب اپنے طرز عمل وعلامت میں کچھ اس انداز سے نظر آتے ہیں کہ اور ایسا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے جو آج کے روکھے پھیکے ناولوں میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہ اس ناول کی ایسی غیر

معمولی خوبی ہے جو دوسرے ناولوں کے مقابلے اسے امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔

کرداروں کے تعلق سے ایک بات بطور خاص کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اگر اس ناول میں نسوانی کردار کچھ زیادہ ہی بولتے بلکہ کہیں کہیں کوستے نظر آتے ہیں تو ترنم نے دو ایسے مرد کردار بھی خلق کئے ہیں جو پورے ناول میں نہ کے برابر بولتے ہیں۔ وہ مرد کردار میں شیبا کے والد اور استاد پروفیسر دانش لیکن والد اور دانش کا کمال یہی ہے کہ ان کی عدم گویائی اور بے صدائی ہی ان کے جوہر بن جاتے ہیں اور بغیر بولے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ایک کردار تہذیب کے حوالے سے دوسرا علم و دانش کے حوالے سے اپنی زبان گنگ سے ایک ایسے جہان کرب و درد کی داستان پیش کر دیتے ہیں کہ قاری پر اثر انداز میں ان کی دردمندانہ تفہیم میں اتر جاتا ہے۔ اس کمال فن میں جتنا ہاتھ ترنم ریاض کا ہے اتنا ہی فکشن کے فن کا بھی، جس کا فائدہ ترنم ریاض نے خوب اٹھایا ہے۔ وارث علوی نے ایک جگہ بڑی اچھی بات لکھی ہے —— " فکشن نے آدمی کو اندر سے سمجھنے کے وہ مواقع فراہم کئے جو ناول اور افسانے سے قبل دنیا میں موجود نہ تھے۔" ایک جگہ اور لکھتے ہیں —— " ناول اور افسانے کا ایک اہم فنکشن انسان اور اس کی فطری اور جبلی طاقتوں کو سمجھنے اور ایک مذہبی اور اخلاقی معاشرے میں اس کی زندگی کے تجربات اور اس کی آزمائشوں کی تفہیم اور تفسیر کا رہا ہے۔"

یہ ناول کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور ترنم ریاض کے لئے اس پس منظر سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ کشمیر کا کلچر، موسم، پھل پھول، چرند پرند ان کے ذہن میں نہیں سانسوں میں بسے ہوئے ہیں اچھی بات یہ ہے کہ ان کے وژن کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس سے دو فائدے ہیں جو آج کے نئے بالکل نئے ناول نگار کم سمجھ پاتے ہیں کہ کسی خاص علاقہ یا ماحول کی ثقافتی دنیا، دنیائے تخلیق کو وہ رنگ و روغن عطا کرتی ہے کہ جس سے قاری ایک نئے قسم کی تخلیقی بصارت اور ثقافت سے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ دوچار کی تخلیقی میں بھی کلیدی رول ادا کرتی ہے اور ایک خاص قسم کی انسیت و لگاؤ بھی پیدا کرتی چلتی ہے اور یہ بھی کہ دیگر زبان و ادب کے قاری صرف فکر و فن نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت سے بھی واقف ہونا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں جو حیثیت پریم چند کی بنی وہ کسی اور کی نہ بن سکی کیونکہ پریم چند کے یہاں ہندوستانی دیہات و قصبات کی تہذیب و معاشرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوں اور اس ناول میں جس انداز سے اخروٹ، خوبانی، سیب، چنار، گلاب اور درجنوں پھل اور پھولوں کا ذکر ہے اس سے نہ صرف منظر یہ دلکشی ابھرتی ہے بلکہ ترنم

نے ان سب کے ذریعہ جو غیر معمولی تخلیقی اشارے کئے ہیں جس سے ناول کا مرکزی خیال خوبصورت اور مضبوط بنتا ہے نیز جس انداز سے گلابی چائے ، قہوہ ، چنار کے پتوں کے نقش والے حقے ، تانبے کے منقش سماوار ، چاول ، کپاس اور مختلف کشمیری لباس کا ذکر کیا ہے اور جس نوع کی ثقافتی دنیا آباد ہوئی ہے وہ بیحد عمدہ ہے اور ان کے درمیان ایسے ایسے معنی خیز جملے نکالے ہیں کہ جس سے ناول کی ضخامت اور دبازت ہلکی پھلکی کپاس کے پھولوں کی طرح محسوس ہونے لگتی ہے۔ لطف کمال یہ ہے کہ ان کی پیشکش میں بوجھل پن اور ثقالت نہیں آنے پاتی جیسا کہ اس نوع کے ناولوں میں آجایا کرتی ہے۔ ترنم ریاض کی سادگی میں فنکاری یا فنکاری میں سادگی کا لوہا آہنی نقاد وارث علوی نے بھی مانا ہے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "ترنم ریاض کی ایک بڑی خوبی ان کی فنکارانہ شخصیت کی سادگی ہے۔ ان کے یہاں کوئی Artistic Pretensions نہیں ، کوئی بلند بانگ وعدے نہیں ، کوئی تکنیک کی طراریاں نہیں ، کہیں نظر نہیں آتا کہ استعارے ، علامتیں اور اساطیر منہ میں سو کینڈل پاور کا بلب لئے جلوہ افروز ہیں۔ ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے۔"

ناول کہیں کہیں بے جا قسم کی نسائیت ، عورت کی مظلومیت و معصومیت کا شکار بھی بنتا ہے۔ کشمیر یا بعض دوسرے مقامات کی تاریخ کا تعارف اور طوالت بھی گراں گزرتی ہے ، کچھ اور باتیں بھی ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہے کہ ایک بڑے اور ضخیم ناول میں ایسے مقامات آتے ہیں۔ زندگی میں بھی آتے ہیں۔ دنیا کا کون سا بڑا ناول ہے جو اس عیب سے پاک ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ناول کا مقصد ، مطلب ، زندگی کی نزاعی اور دفاعی قدروں سے کیسی اور کتنی مماثلتیں رکھتا ہے اور کس نوع کے فلسفہ حیات سے رشتہ استوار کرتے ہوئے بصیرت و آگہی کے کن رویوں اور جذبوں سے دوچار کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک ضخیم ناول میں یہ آگہی اپنا کوئی وحدت تاثر بھی رکھتی ہو اور روایتی قصہ اور پلاٹ بھی۔ ناول کا فن ایک صبر آزما فن ہے اور حقیقت سے پر۔ ماہر فکشن نگار حقیقت کو فسانہ اور فسانے کو حقیقت بنا دیتا ہے۔ یہ دونوں عناصر اس لئے لازمی ہیں کہ فکشن بیک وقت آگہی اور بصیرت کا سامان اکٹھا کرتا ہے تو قدرے تفنن طبع بھی۔ جدید ناول کے فنی معاملات خاصے پھیل گئے ہیں اگر ان سب کو ذہن میں رکھا جائے تو ترنم ریاض کا یہ ناول ہر اعتبار سے اردو کے نئے ناولوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

✠ ✠ ✠

''ذائقہ'' میں نئے ذائقے کی دریافت

مشتاق احمد نوری

'ذائقہ' شوکت حیات کی تازہ ترین کہانی ہے جو'' ذہن جدید'' کے شمارہ ۵۳ میں شائع کی گئی ہے۔ عام قاری کا تاثر یہ ہے کہ 'ذائقہ' منہ کا ذائقہ بگاڑ دیتی ہے اور ہمارے تہذیب وتمدن کے ایوان میں زلزلہ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی اس خیال سے متفق ہوں یا پھر ایسا سوچنے کے لئے آپ کے پاس اپنا جواز بھی ہوگا۔لیکن میں نے اس کہانی کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے ضروری نہیں کہ ہر قاری مجھ سے اتفاق کرے وجہ یہ ہے کہ ادب میں کہا کا بھی 'فرمایا' ہوا حرف آخر نہیں ہوتا۔

اگر اس کہانی کو جنس پر مبنی کہانی سمجھا جائے تو کہانی دوسرے باب میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن شوکت حیات اس فنکار کا نام ہے جس کی بادشاہت کہانی کی سلطنت میں دہائیوں تک قائم رہی ہے۔ اس سے ایسی لچر کہانی کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ شوکت حیات لومڑی کی طرح چالاک ہے اور اس کی نگاہیں عقاب جیسی تیز ہیں۔ وہ اگر چیتے کا جگر رکھتا ہے تو اس میں ہاتھی جیسی بردباری بھی موجود ہے۔ وہ تخلیقیت کے لمحے میں ہرن کی طرح چوکنا رہتا ہے تو پھر اس سے غلطی کے امکان کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ دراصل وہ اپنی زیادہ تر باتیں بین السطور میں کرتا ہے اب قاری کا کام ہے کہ وہ ان باتوں کو بھی سمجھے جو بالواسطہ تحریر میں نہیں لائی گئی ہیں۔

میں اپنی بات کو یوں واضح کروں کہ رسائل یا اخبار میں بچوں کے لئے اکثر لفظوں کی بنیاد پر ایک پہیلی شائع کی جاتی ہے جس میں پورے صفحے پر مختلف مقامات پر نقطے بنائے جاتے ہیں اور نقطوں کا نمبر ایک سے پچیس، پچاس، اسی یا نوے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ان نقطوں سے کوئی امکانی شکل نہیں جھانکتی اور پہیلی بنانے والا یہ ہدایت دیتا ہے کہ بچوں اپنی پنسل سے ایک نمبر سے لے کر سلسلے وار نمبروں تک لکیریں کھینچتے جاؤ پھر دیکھو کون سی شکل ابھرتی ہے۔ بچے جب اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ چاچا نہرو کی تصویر ہے یا گاندھی جی کی یا پھر بچوں کے کسی پسندیدہ جانور کی۔ لیکن اگر بچے نمبروں کی ترتیب بدل لیں تو پھر اصل چہرے کی شناخت نہیں رہتی۔

دراصل شوکت حیات وہ چالاک فنکار ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے سیدھے نہیں کہہ کر پوری کہانی میں نقطوں کی شکل میں بکھیر دیتا ہے اور نمبروں کی کوئی ترتیب بھی نہیں بتاتا۔ اب یہ قاری پر منحصر کرتا ہے کہ وہ نقطوں کو صحیح ترتیب سے ملالے تا کہ وہ امکانی شکل نظر آجائے جو لفظوں کے درمیان مخفی ہے۔ اگر قاری نقطوں کی ترتیب غلط کردے تو پھر صحیح شکل سے آشنائی ممکن نہیں۔

سن ستری کے افسانہ نگار جس کی امامت کا سہرا شوکت حیات کے سر رہا اور اس قافلے میں عبدالصمد، حسین الحق شفق، سلام بن رزاق، ساجد رشید، علی امام، شموئل احمد، حمید سہروردی، طارق چھتاری اور بہت سے اہم فنکار شامل تھے وہ لوگ اس زمانے میں بہت ہی مبہم اور علامتی کہانیاں لکھا کرتے تھے، کبھی کبھی تو کہانی کو سمجھنے کے لئے Key کی بھی اشاعت کی جاتی تھی۔ آپ اسے یوں سمجھیں کہ وہ سادہ کاغذ پر جہاں امکانی شکل کے لئے پچاس نقطے درکار ہوتے تھے وہ صرف پانچ نقطے دیا کرتے تھے اور قاری سے توقع کرتے تھے کہ بقیہ نقطے بھی وہ خود ڈالیں اور نمبروں کی ترتیب بھی خود ہی طے کریں۔ اس طرح الگ الگ قاری اپنی پسند کی تصویر بنانے کے لئے اپنے طور سے آزاد تھا اور ایک ہی کہانی کی کئی امکانی شکلیں سامنے آتی تھیں۔ بعد میں جب روشن بیانیے کا دور آیا تو وہی سن ستری افسانہ نگار یوٹرن لیتے ہوئے بیانیہ کی جانب پلٹ آئے اور ایسی کہانیاں لکھنی شروع کیں جو بظاہر یک سمتی نظر آتی ہیں لیکن جب آپ تھوڑی سی کاوش کرتے ہیں تو سمتوں کا پھیلاؤ اس طرح ہوتا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔

کہانی 'ذائقہ' کو میں نے الگ انداز سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اس نکتے پر بحث کی جاتی ہے کہ ایسا ہوا، ویسا ہوا جو ظاہری طور پر اچھا یا خراب، قابل مذمت یا قابل ستائش

ہوسکتا ہے۔ میں 'کہا ہوا' پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ ہوا اس سے تو آپ واقف ہو ہی چکے ہیں۔ میرے ذہن میں نکتہ صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کن حالات میں ہوا؟ اور ایسا ہونے کے لئے بنیادی وجوہات کیا کیا ہیں؟

کہانی مختصراً یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک پر فضا پہاڑی مقام پر ایک جدید ترین انجینئرنگ کالج ہے جہاں جدت کی ساری سہولتیں موجود ہیں۔ وہ کسی ترقی یافتہ مغربی ملک کے انتہائی اونچے درجے کے عالیشان تعلیمی ادارے کی یاد دلاتا ہے۔ طالب علم جدید تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ان کی اپنی تہذیب، اپنا تمدن ہے جو پرکھوں کی تہذیب سے الگ ہے۔ رومانس ان کے لئے ویسا ہی جیسا پیاس بجھانے کے لئے ہم بلا جھجک ایک گلاس پانی اٹھا کر پی لیتے ہیں۔ وہ ویک اینڈ پر جسمانی مکالمے کو زندگی کا عام حصہ سمجھتے ہیں۔ سولہ سترہ سال کا سراج جب مایا کے ساتھ ویک اینڈ پر جسمانی مکالمے سے گزرتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ کمی اور ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے گھر کی یاد آتی ہے اور اس کی ماں شدت سے اس کے ذہن میں نمودار ہوتی ہے۔

اگر یہ کہانی جنس پر مبنی ہوتی تو اس کہانی کو اسی جگہ بھی ختم کیا جاسکتا تھا لیکن فنکار بہت چالاک ہے اس لئے اس سے اس پھچھلے پن کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے بعد سراج کی ماں رانی کا ذکر ہے۔ جس کی شادی پندرہویں سال میں ہوئی اور سولہویں سال میں سراج پیدا ہوگیا۔ اب سراج سولہ سترہ سال کا ہے تو ظاہری بات ہے کہ بیٹے کی شکل میں کہیں نہ کہیں باپ کی شبیہ ابھرتی ہوگی۔ اسی لئے تو "اس کا بیٹا سولہ سترہ سال کے سجیلے نوجوان کا روپ اختیار کر کے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا ہے" اب یہاں کہانی میں ایک اور بات در آتی ہے۔ رانی تیس بتیس سال کی دہلیز پر پہنچ کر جب جوانی کا مطلب صحیح ڈھنگ سے سمجھنے لگی ہے تو اس کی چنگاری کی آبیاری کرنے والا اس کا شوہر پردیس میں بچے کی اعلیٰ تعلیم اور کشادہ گھر بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے اور ادھر خود سراج جب گاؤں میں دوسری عورتوں کو کمر پر گاگر رکھ کر پنگھٹ پر جاتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک عجیب سی خواہش کلبلانے لگتی ہے اور پنگھٹ کی گوری کی شکل میں اپنی ماں کو تصوراتی طور پر دیکھنے لگتا ہے۔ بقول شوکت حیات " یہ تصور اس کے معصوم ذہن میں اچانک کونپل کی طرح پھوٹ کر دیکھتے دیکھتے تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔"

فنکار تو یہ بات صرف اطلاع کے لئے فراہم کرتا ہے لیکن ایسی خواہشیں کیوں اور کن حالات میں کلبلانے لگتی ہیں ان باتوں کو قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ایسا کیوں

ہوا؟ دراصل کہانی کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فرائڈ کی مشہور تھیوری ہے کہ ماں کا بیٹے کی طرف جھکاؤ اور باپ کا بیٹی سے لگاؤ بھی بنیادی طور پر جنس سے متحرک ہوتا ہے۔ اس معاملے میں آڈیپس کمپلکس کی تھیوری بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ چلئے مان لیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ان محرکات کو دو آتشہ بنانے کے لئے کالج کی جدید تہذیب نے کتنا رول ادا کیا ہے۔ فنکار کہانی کے شروع میں بتاتا ہے کہ انجینئرنگ کے طالب علموں نے اپنے طور پر اپنی تہذیب بنائی ہے۔ ان کی زندگی میں پرانے اقدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے نزدیک نہ رشتوں کی پاکیزگی کوئی معنی رکھتی ہے اور ان کی تقدیس کا احترام ان پر واجب ہے۔ وہ تو خود اپنے آدم وحوا بنے ہوتے ہیں۔ پرانی تہذیب کے مقتل پر ان لوگوں نے اپنی جدید تہذیب کی عمارت کھڑی کی ہے اور ہر شئے کو دیکھنے کا ان کا اپنا اخذ کردہ نظریہ ہے۔

اب کہانی کے اس پیراگراف کو ایک بار پھر سے دیکھیں ——

"اس رات رانی نقطۂ ابال کو پار کر رہی تھی، شوہر ایک مدت سے نہیں آیا تھا، ہر سال نہ آ کر اپنے آنے جانے کا خرچ بچاتے ہوئے وہ بچے کی اعلیٰ تعلیم اور ایک کشادہ گھر بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

سراج کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں...... وہ رانی کے اضطراب کو دیکھ رہا تھا...... محسوس کر رہا تھا...... پنگھٹ پر پہنچی ہوئی عورت نے گھڑا بھرنے کے بعد پانی ڈھالنا شروع کیا۔ سراج نے ہتھیلیوں کے کٹورے سے نکھرتے ہوئے صاف و شفاف پانی کی دھار کو غٹاغٹ پینا شروع کر دیا۔ حلق تک اس کی پوری آنت جل تھل ہوگئی اسے ایک گونہ سکون حاصل ہوا۔"

یہ معاملہ جو اچانک ہوگیا کوئی ایک دن کا نہیں۔ فنکار کی اصطلاح کے مطابق:

"شعلے اٹھتے رہے اور موسلا دھار بارش میں بجھتے بھی رہے۔ عجیب وغریب دلفریب منظر، جیسے دھوپ اور بارش نے بیک وقت مصافحہ اور معانقہ کرنا شروع کر دیا ہو۔ دھوپ اور چھاؤں برسنے کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔"

دراصل یہ عبارت عام طور پر قاری ہضم نہیں کر پا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر کہانی کو مذموم ثابت کرنے کی کوشش ہوسکتی ہے۔

کہانی یہاں پر بھی ختم ہوسکتی تھی کیونکہ اس میں ذہن کو جھٹکا دینے والا کلائمکس موجود ہے لیکن شوکت حیات یہاں پھنس جاتے اور اپنا بچاؤ نہیں کر پاتے۔ لیکن کہانی تو کچھ اور ہے۔

کہانی سراج کے گھر سے ہوسٹل کا رخ کرتی ہے۔ ہوسٹل میں بھی سراج ماں کی تشویش بھری آنکھوں کی گہری اداسی محسوس کرتا ہے۔ ادھر رانی کا پریشان ہونا، ڈاکٹر کے یہاں چکر لگانا، ڈاکٹری نسخہ ڈکشنری میں اس جگہ رکھنا جہاں لفظ 'ایم' کے معنی کی شروعات ہوتی ہے۔ یہ اس بات کو بتاتا ہے کہ رانی اپنے حادثاتی عمل پر شرمندہ ہے، اس کا مینس بھی رکا ہوا ہے۔ اس کی بوکھلاہٹ اور ڈکشنری میں نسخے کو رکھنا اس بات کا اعلامیہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح ڈکشنری میں ہزاروں الفاظ ہیں اسی طرح سماج کے ہزاروں لوگوں کے سامنے اسے شرمندہ ہونا پڑ سکتا ہے۔ یا پھر یہ لفظ 'ایم' مین بھی ہوسکتا ہے جو اس بات کو بتاتا ہے اس کا مرد اس سے کوسوں دور ہے اور اس کی کمی، اس کی خواہش کا ابال ہزاروں لوگوں کے سامنے اس کی رسوائی کا سبب بن گیا ہے۔

اب یہاں سے کہانی کار اس کہانی کو الگ سمت میں موڑ دیتا ہے اور ہوسٹل کے کھانے کے ذائقے کی بات کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے ہوسٹل کے کھانے میں ذائقے کی کمی ہے اور سارے بچوں کی زبان پر ماں کے کھانے کا ذائقہ ہے جو ہوسٹل کے کھانے میں مفقود ہے۔ پھر بچے ڈائریکٹر کے پاس شکایت لے کر جاتے ہیں اور ہوسٹل کے کھانے کی بدمزدگی کی شکایت کرتے ہوئے اس مسئلہ کا حل نکالنے کی گزارش کرتے ہیں لیکن ڈائریکٹر کا جواب سنئے:

> ''آج سے چالیس سال پہلے گاؤں چھوٹا، گھر چھوٹا، ماں چھوٹی، تب سے دربدر بھٹکتا رہا ہوں۔ کہاں کہاں نہیں گیا، بیرونی ملکوں تک کا ایک سے ایک کھانا کھایا لیکن ماں کے ہاتھ کے ذائقے کے لئے ترستا رہ گیا۔''

پھر ڈائریکٹر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور گہری سانسوں کے درمیان یہ کہتا ہے:

> ''خدا کرے تم سب اونچے عہدے اور مرتبے حاصل کرو اگر زندگی میں کسی مقام پر ماں کے کھانے کا ذائقہ تمہیں مل جائے تو مجھے مطلع کرنا۔ زندہ رہا تو اس مقام کی مٹی چومنے ضرور آؤں گا۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈائرکٹر بھی ماں کے ہاتھ کے کھانے کے ذائقے سے محروم ہو چکا ہے اور سارے زمانے مین اسے وہ شئے نہیں مل سکی اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو نئی نسل کالج میں ہے اور ماں کے ہاتھ کا ذائقہ ہوسٹل کے بدمزدہ کھانے میں تلاش کرنے میں ناکام ہے اس سے پہلے کی نسل بھی ڈائریکٹر کی شکل میں اس ذائقے سے محروم رہی ہے۔ اس طرح یہ ایک نہیں دونسلوں کی محرومی بن گئی ہے۔

کیا شوکت حیات جیسا فن کار ہوسٹل کے بدمزہ کھانے کے ذائقے پر کہانی لکھ کر قاری کا

وقت برباد کرنا چاہتا ہے جو کہ ہر کالج کے ہوسٹل کی ایک تہذیب بن گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر شوکت حیات کو کہانی لکھنا بند کر دینا چاہئے کیونکہ اب اردو کہانی پر اتنا بھی برا وقت نہیں آیا ہے کہ ہوسٹل کے کھانے کے بدمزہ ذائقے کو کہانی کا موضوع بنایا جا سکے تو پھر شوکت حیات کی مراد اس ذائقے سے کیا ہے؟ وہ بار بار ماں کے ہاتھ کا ذائقہ کیوں یاد دلانا چاہتا ہے۔ دراصل کہانی کا نقطہ عروج بھی ذائقہ ہے۔

اب میں آپ کو پھر کہانی کے پہلے باب کی طرف لے چلنا چاہتا ہوں جب وہ لڑکوں کی اپنی تہذیب کی بات کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ وہ سب ایک نئی تہذیب کی پرورش، پرداخت کے آدم وحوا بنے ہوتے تھے۔ دراصل فنکار کی چھٹپٹاہٹ یہی تہذیب ہے۔ کوئی بھی انسان اپنی پہلی تہذیب ماں کی گود میں سیکھتا ہے اور تہذیب کا وہ ذائقہ جو وہ پہلی بار ماں کے دودھ کے ساتھ محسوس کرتا ہے اسے زندگی کے ہر موڑ پر لاشعوری طور پر تلاش کرتا پھرتا ہے۔ یہاں فن کار تہذیب کے اسی ذائقے کی بات کرتا ہے جس سے آج کی نئی نسل مکمل طور سے بے بہرہ ہو چکی ہے اور اپنے لئے ایک نئی تہذیب کی عبارت لکھنے پر کمر بستہ ہے اگر لاشعوری طور پر تہذیب کا وہ ذائقہ جو انہوں نے ماں کے زیر سایہ حاصل کیا تھا اس کی محرومیت کا سایہ بھی انہیں جدید تہذیب کے درمیان ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے۔

اب آپ اسے یوں دیکھیں کہ جب کالج کا لڑکا اور لڑکی جسمانی مکالمے سے دوچار ہوتے ہیں تو انہیں کہیں نہ کہیں ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن جب یہی مکالمہ سراج اور رانی کے درمیان ہوتا ہے تو ''حلق تک اس کی پوری آنت جل تھل ہو گئی اسے یک گونہ سکون حاصل ہوا'' آخر ان دونوں جسمانی مکالمے کے ذریعہ فن کار کس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے اور صحیح پوچھئے تو کہانی کا یہ ایک بہت ہی اہم نکتہ ہے۔ پہلا جسمانی مکالمہ ان دو نئی نسل کے درمیان ہے جو بالکل نئی تہذیب کے پروردہ ہیں وہ تہذیب کے پرانے ذائقے سے محروم ہیں۔

دونوں طرف ناتجربہ کاری ہے اسی لئے انہیں اس کھلے پن میں بھی ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے جبکہ دوسرے جسمانی مکالمے میں ایک طرف سولہ سال کی ناتجربہ کاری ہے تو دوسری طرف سولہ سال کا تجربہ ہے۔ سولہ سال کا تہذیبی تجربہ، ناتجربہ کاری کو سنبھال لیتا ہے اسی لئے آسودگی کا احساس حلق تک ہوتا ہے۔ اس ذائقے کو جسے ماں کے دودھ کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے اسی ذائقے کی محرومی کا نوحہ ہے شوکت حیات کی کہانی 'ذائقہ'۔

یہاں یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ رانی اور سراج کے بجائے کسی اور سے سراج کا

جسمانی مکالمہ دکھایا جا سکتا تھا۔ لیکن سچائی تو یہ ہے کہ کہانی کار تہذیبی زوال کی انتہائی شدت کے لئے ایسے حادثے کراتا ہے کیونکہ تہذیبی زوال کی اس سے بدترین پستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جہاں آدمی جانوروں کی طرح سارے رشتوں کا احترام بھول جاتا ہے۔ (ویسے آج کے دور میں رشتوں کی پاکیزگی اور اس کا احترام بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔)

اب آیئے کہانی کو ایک الگ نظریئے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ رانی جسمانی طور پر کافی جل تھل ہے، اس کے حسن کا یہ عالم ہے کہ مرد تو مرد عورتیں بھی اسے دیکھنے کی خواہش نہیں دبا پاتیں۔ جوانی جب انگارے کی دہلیز پر آئی تو شرارے دو آتشہ ہو جاتے ہیں اور دریا پایاب۔ اس کا شوہر بچوں اور گھر کے مستقبل سنوارنے کے لئے بیوی، بچوں سے دور ہے اور برابر نہ آ کر اپنے آنے جانے کا کرایہ بھی بھیج دیتا ہے تاکہ مستقبل مزید روشن ہو۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آسائشوں کی فراوانی جسم کی بھوک مٹاتی نہیں اور بڑھا دیتی ہے۔ جب یہ بھوک شدت اختیار کرتی ہے تو اس کا رخ کس سمت ہوگا اس کا فیصلہ فرد کے بجائے بھوک کرنے لگتی ہے۔ اسے یوں سمجھا جائے کہ پانی کے فطری بہاؤ کو اگر نہ روکا جائے تو وہ اپنا راستہ آپ اختیار کرتے ہوئے اپنی طے منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے لیکن جب جب باندھ باندھ کر اس کے فطری بہاؤ کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ تلملانے لگتا ہے اور اس کے غیض و غضب کی انتہا مضبوط سے مضبوط باندھ کے پشتے کو بھی توڑ کر سیلاب کی صورت تباہی کی وجہ بنتی ہے۔ اس وقت سیلاب کا شکار کچا مکان ہو رہا ہے یا پختہ، مویشی مر رہے ہیں یا انسانی جانوں کا نقصان ہو رہا ہے یا سیلاب کا پانی نہیں دیکھتا۔ غیض و غضب کے عالم میں نہ تو تہذیب نظر آتی ہے اور نہ ہی اس میں تمدن کی تلاش ممکن رہ جاتی۔ وہ تو اپنے غیض و غضب کے سامنے پڑنے والے کو خش و خاشاک میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے اور بالواسطہ یہی پیغام دیتا ہے جب جب کسی کے فطری بہاؤ کو غیر فطری طریقے سے روکنے کی کوشش ہوگی اس کا انجام ہر حال میں برا ہی ہوگا۔

یہاں بھی وہی معاملہ ہے، سماج کے اندر پیسے کی ہوڑ، آسائشوں کی فراوانی، سب سے آگے نکلنے کی للک، انسان کو اپنے تہذیبی اثاثے سے غیر فطری طور پر محروم کرتی جا رہی ہے۔ اسے بدیش کی دولت اور گھر کا تابناک مستقبل نظر آتا ہے۔ بیوی کی رنگین ساڑی اور کلائی کے سونے کی کنگن کی چمک بھی نظر آتی ہے لیکن اس چمک دمک کے اندر وہ اس بھوک سے بے خبر رہتا ہے جو جسم کی اس رنگینی کے اندر بے قابو سیلاب کی طرح مضبوط سے مضبوط پشتہ توڑنے کے لئے بے قرار رہتی ہے۔

شوکت حیات کی ذہنی تربیت بائیں بازو کی تحریک نے کی ہے۔ اس کا اشتراکی ذہن ہر طرح کے ظلم اور بھوک کے خلاف 'بانگ' دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ وہ 'سانپ سے نہ ڈرنے والا بچہ' بھی خلق کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف وہ اپنے قلم کو تلوار بنالیتا ہے۔ اس کے ذہن میں بائیں بازو کی تحریک کا جو ذائقہ ہے اسے وہ ہر ناآسودگی میں تلاش کرتا ہے اور در پردہ آسودہ حال لوگوں کو یہ انتباہ بھی کرتا ہے کہ ناآسودگی اور محرومی کا سیلاب جب جب آتا ہے تو اچھے اچھوں کی ہوا اکھڑ جاتی ہے اور ایک نئے نکسل واد کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ پیاس کی شدت نہ منرل واٹر دیکھتی ہے اور نہ ہی نہر کا پانی کیوں کہ شدت سارے تمیز مٹا دیتی ہے۔

کہانی میں اس نے تیستہ ندی کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک پہاڑی ندی ہے۔ عام طور سے پہاڑی ندی کا پانی بہت صاف اور میٹھا ہوتا ہے لیکن اس تیستہ ندی کا پانی پہاڑوں میں بل کھاتے گھاٹ گھات سے لپیٹتے ہوئے کھارا گیا ہے اور کھارا پانی زندگی کی علامت نہیں بن سکتا۔ دراصل کہانی کار اس ندی کے کھارے پن سے بھی ہماری تہذیب کے دیوالیہ پن کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ میٹھی تہذیب ماں کے دودھ کے ساتھ جسم کے شریانوں میں اترتی تھی وہ آج کے جدید ترین تہذیب سے آلودہ ہو کر کھارا ہو گئی ہے۔

شوکت حیات ایک عرصے تک علامتی کہانیاں لکھتا رہا ہے اس لئے وہ علامتوں سے اپنے آپ کو دور نہیں کر سکا ہے۔ اب اس نے علامتوں کی دریافت اپنے طور پر کی ہے جس کا استعمال اپنی تخلیق میں کرنے لگا ہے۔ اس کا بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہونا بھی اس کی کہانیوں کے بین السطور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ کہانی ہمارے تہذیبی زوال کی انتہا کی کہانی ہے جہاں نہ تو شرافت ہے اور نہ اقدار کی پاسداری۔ رشتوں کی پاکیزگی اور ان کے تقدس کا احترام بھی ملتا ہے۔ یہ کہانی یہ بھی بتاتی ہے کہ آج کے ہپوکریٹ دور میں ہم ہر طرح کی آلودگی سے متاثر ہو کر اپنے تہذیبی تشخص سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور اپنے اقدار کی پاسداری جسے ہم پرکھوں کی امانت سمجھ کر نئی نسل کو سونپنا چاہتے ہیں اسے آج کی نسل نے سنبھالنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ وہ اس تہذیبی ذائقے سے قطعی محروم ہو چکی ہے جو ماں کے دودھ کے ساتھ ہی انہوں نے حاصل کیا تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

اقبال اور کالی داس کی شاعری میں مناظرِ فطرت

شیخ عقیل احمد

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور اس کے ذریعے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ کہ اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں"۔

(قرآن شریف کے سورۂ فاطر ۲۷، ۲۵، ۳۵)

قرآن شریف میں مطالعہ کائنات سے متعلق ۷۵۶ آیتیں ہیں جو اہلِ علم کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ موجوداتِ کائنات میں پائی جانے والی خوبیوں کا جوہر جو ناظرین میں لذت اور سرور کی خاص کیفیت پیدا کرتا ہے، دراصل حسن کہلاتا ہے اور حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے رجحانات انسانوں میں عموماً اور تخلیق کاروں میں خصوصاً پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔ حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے بعد ہی تخلیق کار اشیاء کے مظہری پہلوؤں میں ایک طرح کی حقیقت سمو دینے کا کام کرتا ہے جسے فن کہا جاتا ہے۔ موسیقی، نغمہ و آہنگ، رنگ آمیزی یا تصویر کشی وغیرہ کچھ ایسے

فنون ہیں جو ہماری پیشہ ورانہ اور کاروباری امور اور سیاسی واقتصادی زندگی کے فرائض کو پورا کرنے میں ہونے والی محنت اور تھکن کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ہماری پریشان ومضطرب زندگی کو ایک طرح کا سکون بخشتے ہیں۔اسی لئے عظیم شاعر یا فن کار کچھ ایسی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں جو خود ان کی حیات کی بقا کے لئے اتنی ضروری نہیں ہوا کرتیں لیکن پھر بھی ایسا کرتے ہوئے انہیں مسرت ضرور ہوتی ہے۔اسی لئے ایک تخلیق کار اپنی فطری ذہانت کے سہارے ایک قسم کی شاہانہ فیاضیوں کا برملا اظہار کرتا رہتا ہے۔ان تخلیق کاروں میں سنسکرت کے مہا کوی کالی داس اور اردو کے عظیم شاعر علاّمہ اقبال خاص اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے حسین مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی ہے۔ان شعرا کی شاعری میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کائنات کیا ہے؟ فطرت کسے کہتے ہیں؟ کیا فطرتِ کائنات واقعی بے حد حسین ہے؟ یا صرف ایک بدصورت مادہ ہے؟ فطرتِ کائنات اگر حسین ہے تو پھر حسن کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب فلسفیوں اور صوفیوں نے دیا ہے۔ مطالعۂ کائنات فلسفیوں اور صوفیوں کا اہم موضوع رہا ہے۔اس کے متعلق متعدد فلسفیوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔مثلاً لائبینیز کے فلسفۂ مونادیت کے مطابق کائنات مونادوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔جو نہایت ہی سادہ، نا قابلِ تقسیم اور غیر فانی ہے۔(واضح ہو کہ موناد ایک طرح کے مراکز قوت ہیں جن میں سے ہر وقت توانائی پھوٹتی رہتی ہے۔مونادوں کو روحیتی ذرّات (Spiritual Atoms) بھی کہا جاتا ہے۔لائبنیز کا یہ خیال کہ کائنات مونادوں کا مجموعہ ہے صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس نے مونادوں کو روحیتی ذرّات یعنی Spiritual Atoms کہا ہے جو قوت کے مراکز ہیں اور جن سے توانائی نکلتی رہتی۔جدید سائنسی تھیوریز (Theories) نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادے کا سب سے چھوٹا ذرہ جسے تقسیم نہیں کیا جا سکے Atom کہلاتا ہے جس کے اندر بیشمار توانائی ہوتی ہے Atom کے اندر پائے جانے والے Electron,Proton and Nitron توانائی کے سرچشمے ہیں۔لیکن لائبنیز کا یہ کہنا کہ کائنات نہایت سادہ ہے قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ موناد اگر مراکز توانائی ہے تو آفتاب کی ست رنگی روشنی، پہاڑ کی اونچی چوٹیوں سے بہتے ہوئے خوبصورت جھرنے کیا توانائی کے سرچشمے نہیں ہیں؟ اگر ہاں تو پھر کائنات سادہ کہاں ہے۔

برکلے نے بھی فطرتِ کائنات کے متعلق اپنا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے۔وہ خارجی عالم کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تجربہ ہمیں اشیا کی صفات کا علم

فراہم کرتا ہے اور صفات صرف ہمارے نفس یا ذہن کے تصورات ہیں۔ اس لئے فطرت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فطرت دراصل تصورات اور حسیات کا ایک نظام ہے جسے خدا کچھ خاص اصولوں کے تحت محدود اذہان میں پیدا کر دیتا ہے۔

فطرتِ کائنات کے سلسلے میں وھائیٹ ہیڈ نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخیل کے خوبصورت موضوعات بنتے رہے ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ شعراء غلط فہمی کے شکار ہیں اور انھیں اپنی نظموں میں خود اپنی ذات کو موضوع داد و دہش بنانا چاہیے اور تحسین بالذات اور بالذات تشکر کے کلمات ادا کرنے چاہئیں کیونکہ یہ سارا حسن فطرت خود فطرت میں موجود نہیں، بلکہ یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوبصورت اور خوشنما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ فطرت بالذات تو ایک بوجھل ومکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی رنگ وآہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بو وسرور ہے۔ نہ تو فطرت کوئی شئے چشیدنی ہے اور نہ ہی یہ کوئی عالم دیدنی ہے بلکہ فطرت تو بالذات ایک سریع التغیر چیز ہے جس کا کوئی سرا نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی معنی ومفہوم ہیں۔ نہ ہی اس میں غایات ومقاصد ہیں۔"

(بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص:۸۸-۸۹)

وہائٹ ہیڈ کے پہلے جملے میں ہی تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ:

"گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخیل کے خوبصورت موضوعات بنتے رہے ہیں۔"

دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ:

"فطرت بالذات تو ایک بوجھل ومکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی رنگ وآہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بو وسرور ہے۔"

تو پھر گلاب کی خوشبو، بلبل کے سرور انگیز گیت اور سورج کی درخشندگی کیا فطرت کے حسین مناظر نہیں ہیں؟ اور اگر یہ حسین مناظر نہیں ہیں تو پھر شاعرانہ تخیل کے خوبصورت

موضوعات کیسے بنتے رہے ہیں؟ البتہ وہائیٹ ہیڈ کا یہ کہنا درست ہے کہ:

"یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوبصورت اور خوشنما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔"

وہائیٹ ہیڈ کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے کروچے نے حسن کے موضوعی نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

"حسن کلیتاً یا ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ کہ طبعی اشیاء بجائے خود اپنے اندر ذاتی طور پر کوئی حسن نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان اشیاء کے اندر حسن کا ادراک خود ہمارے ذہن کا اعجاز ہوا کرتا ہے۔ اور انھیں ہمارا ذہن ہی حسین، قبیح اور جلیل بناتا ہے۔"

(بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص: ۴۷-۴۶)

حسن کے متعلق رسکن کا خیال ہے کہ ہم حسن کی حقیقت سے اس وقت واقف ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر خدا کے ہر کام میں حسن و جمال کا احساس کرنے لگ جائیں۔ لیکس نے حسن کو ایک جال قرار دیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس سے قدرت عقل یا شعور کا شکار کرتی ہے۔

حسن کے متعلق اہلِ علم حضرات کا خیال ہے کہ کوئی چیز صرف اسی قدر حسین ہوتی ہے، جس قدر کہ اس چیز کو اپنی نوع کے اعتبار سے ایک خاص تناسب حسن کا درکار ہوتا ہو۔ چنانچہ ہم کو مثالی حسن کا مکمل عرفان صرف اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ ہم فنافی التصور ہو جائیں۔ یہ تصور ایک ایسا نقطۂ عروج ہے، کہ جہاں تمام خواہشیں یا تمام ارادے ایک ارادۂ مطلق یا خواہش کلی میں ضم ہو کر ایک بڑے کل میں فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑے شاعر کا شدّتِ احساس ایک خاص تناسب حسن والی اشیا کو دیکھنے کے بعد شدید ہو جاتا ہے یا وہ ان کے تصور میں اپنے آپ کو فنا کر لیتے ہیں اس لئے فطرتِ کائنات انہیں بیحد حسین نظر آتی ہے اور مناظر فطرت کی حسین تصویر کشی کرنے لگتے ہیں۔

وہائیٹ ہیڈ کے برخلاف ایمرسن کا خیال ہے کہ یہ کائنات بیحد خوبصورت ہے۔ ہمارے چاروں طرف سحر انگیز کیفیت کا جال سا بچھا ہوا ہے جو اپنی طرف ناظرین کو متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم دنیاوی اور کاروباری معاملات میں اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ کائنات کا حسن ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہم پھر سے اپنے بچپن میں لوٹ جائیں اور ایک بچّے کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کائنات بیحد حسین ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"ہمارے چاروں طرف کائنات کی سحر انگیز کیفیات نے ایک جال سا بنا رکھا ہے۔اور ہم خوبصورتی کے سمندر میں گویا ڈوبے ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے دنیاوی مسائل میں گرفتار ہونے کے باعث اور اپنے ماحول کا ہر روز نظارہ کرنے کی وجہ سے اس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ہماری آنکھیں کائنات کی رعنائیوں کے لیے اندھی ہو کر رہ گئی ہیں۔اگر ایک لمحے کے لیے ہمارا بچپن واپس آجائے تو ہمیں اڑتے ہوئے طیور، چمکتے ہوئے تارے حیران نظروں والے پھول اور شفق کے لامثال رنگ ایک مسحور کن ترتیب کی صورت میں نظر آئیں اور ہم فرطِ طرب سے لرز اٹھیں۔"

(بحوالہ وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ص-۲۷)

اس سلسلے میں ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات ایک عالمِ متصورہ (The world of Ideas) ہے۔اس کو ہم عالمِ فطرت کہتے ہیں۔اس کے مطابق عالمِ فطرت دراصل افکار و تصورات کا ایک عالم خارجی ہے اور عقل مطلق (یعنی خدا) اپنے آپ کو اشکالِ خارجیہ میں تبدیل کر کے ہمارے سامنے عالمِ ظاہر کے طور پر ہر وقت پیش ہوتی رہتی ہے۔

ہیگل کے جدلیاتی تصور کے مطابق "نفس کی دنیا" یعنی مبدائے اوّل ہی اصل ہے اور مادہ نفس (یعنی مبدائے اوّل) کا مظہر ہے۔ہیگل کہتا ہے کہ جدلیاتی عمل، نفس سے مادہ کی جانب نزول کرتا ہے گویا لطیف ترین تصور جب بلندی سے پستی کی طرف یا عروج سے زوال کی جانب آتا ہے تو لطیف ترین سے کثیف ترین صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ کثیف ترین صورت مادہ کہلاتی ہے جسے ہم عالمِ ظاہر کہتے ہیں اور جسے ہمارے حواس اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور ہم اس کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے مطابق کائنات فطرت خدا کا عین ہے۔ابنِ عربی نے اس سلسلے میں یہ آیت "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق" (یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اس لیے میں نے خلقت کو پیدا کیا)۔گویا یہ تمام کائنات اسی وجود مطلق کی 'تجلی' ہے۔اگر فطرتِ کائنات واقعی خدائے مطلق کی تجلی ہے تو یہ یقیناً بے حد حسین ہے۔غالب بھی اس نظریے سے متفق ہیں اس لئے اس نظریے کی وضاحت کے لئے انہوں نے مختلف قسم کے الگ الگ رنگوں کے پھولوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان مختلف رنگوں میں بہار کا ثبوت ملتا ہے:

ہے رنگ لالہ وگل ونسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اِثبات چاہیے

یعنی موجوداتِ کائنات اپنے رنگ وروپ کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔

علامہ اقبال بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنی نظم 'ہمالہ' میں 'ہمالہ' کو خدا کے جلوہ سے تعبیر کہا ہے:

ایک جلوہ تھا کلیمِ طور سینا کے لیے
تو تجلّی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اس لئے فطرت کی منظر کشی کرتے وقت اکثر مقامات پر ان کا وجود فطرت میں فنا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن فنا کے مقام سے جب واپس آتے ہیں تو ان پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ کائناتِ فطرت اگر ایک جسم ہے تو انسان اس کی روح ہے اس لئے اقبال انسان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں اور فلسفہ' خودی جیسے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف کالی داس جب رگھوونشم، کمار سمبھوَ، میگھ دوتم اور ابھگیان شکنتلم جیسے مہا کاویہ کی تخلیق کر رہے تھے اس وقت ان کے ذہن میں موجودہ دنیا نہیں تھی جسے 'کل یگ' سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں وہ دنیا تھی جسے ''ست یگ' کہا جاتا تھا اور جس دنیا میں تمام دیوی اور دیوتا چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کالی داس کی نظر میں ''ہمالہ'' صرف ایک پہاڑ ہی نہیں بلکہ ایک دیوتا بھی تھا جس کی بیٹی پاروتی تھی۔ اس زمانے میں زمین سے سورگ لوک میں جانا اور وہاں سے واپس آجانا ایک عام بات تھی۔ پہاڑ کی وادیوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلانے اور تمام گلستاں کو پھولوں کی خوشبو سے معطر کرنے کیلئے ''کام دیوٗ'' بھی مامور کئے جاتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں کالی داس کی تخلیقات میں فطرت کی حسین مناظر کی تصویر کشی نہیں کی گئی ہوتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے فطرت کی جو منظر کشی کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ فطرت کے مناظر کو دلکش و دلفریب بنانے کیلئے کس کس طرح کی تشبیہات واستعارات کا استعمال کیا ہے۔ ایک ہی منظر کو دونوں شاعروں نے کس طرح پیش کیا ہے؟ ان تمام پہلوؤں کو جاننے کے لئے دونوں شاعروں نے فطرت کی جو تصویر کشی کی ہے اس کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

علامہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں فطرت کی منظر کشی کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں۔ بانگِ درا کی پہلی ہی نظم ''ہمالہ'' میں اقبال نے خوبصورت تشبیہات واستعارات کی مدد سے قدرت کا مطالعہ

اور فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی شاعری بھی کی ہے۔ ہمالہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کی جغرافیائی حالت، عظمت، اہمیت اور افادیت کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ اس نظم کا پہلا بند ہے:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

اس بند کے پہلے ہی مصرعے میں "فصیل کشورِ ہندوستاں" کہہ کر اقبال نے ہمالہ کی وسعت اور پھیلاؤ کا منظر پیش کرنے کے ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے کہ ہندوستان کی وہ سرحدیں جو خشکی میں ہیں، ہمالہ کے لمبے سلسلے سے گھری ہوئی ہیں۔ اسی بات کو کالی داس نے اپنی تخلیق "کمار سمبھو" میں پہلے سرگ کے پہلے شلوک میں اس طرح کہی ہے کہ بھارت کے شمال میں دیوتا کی طرح عبادت کے لائق ہمالہ نام کا بڑا بھاری پہاڑ ہے جو مشرق اور مغرب کے سمندری ساحل تک پھیلا ہوا ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس سرزمین کو ماپنے اور تولنے کا میزان ہو۔ کالی داس نے ہمالہ کو دیوتا کی طرح لائقِ عبادت کہہ کر ہندو مائیتھولوجی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے مطابق ہمالہ صرف ایک پہاڑ ہی نہیں ہے بلکہ بھگوان شیو کی اہلیہ پاروتی کے جنمی (تخلیق کا سرچشمہ) بھی ہیں۔ اقبال نے بھی کہا ہے کہ اہلِ بینا کے لئے ہمالہ سراپا تجلّیِ خدا ہے:

تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

اقبال نے جب یہ کہا ہے کہ آسمان اس کی بلندی کو جھک کر چومتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی بلندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ زمین سے آسمان تک کا نظارہ آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے اور ساتھ ہی زمین و آسمان کی دوری بھی مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمالہ کو یہ کہہ کر کہ "تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں" اس کے مناظر کو مزید دلفریب بنا دیا ہے کیوں کہ جوانی سے زیادہ پُرکشش کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے شعر میں علامہ اقبال نے ہمالہ پہاڑ کے نظارے پیش کرنے کے لیے اس کی چوٹیوں کو ثریا سے سرگوشی کرتے ہوئے دکھایا ہے اور یہ کہا ہے کہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی ہمالہ کا وطن آسمان ہے۔ اس سے نہ صرف ہمالہ کی بلندی کا احساس ہوتا ہے بلکہ ہمالہ کی وادیوں سے چوٹیوں تک اور چوٹیوں سے تاروں کی انجمن تک کے

مناظر آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں:

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

شاعر نے اس کے علاوہ ہمالہ کے دامن میں پائی جانے ولی کالی گھٹاؤں، چشموں اور ہوا کے جھونکوں کی بھی انتہائی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ فطرت کے ان حسین مناظر کی تصویر کشی کرنے کے لیے شاعر نے ہمالہ کی گود میں پائے جانے والے چشموں کے پانی کو صاف اور شفاف بتانے کے لیے اس کی سطح کو آئینۂ سیال قرار دیا ہے جس میں فطرت اپنی تصویر دیکھا کرتی ہے:

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے

آئینے میں جب کوئی حسینہ اپنے حسن کو دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہونے لگتی ہے مثلاً نپولین کی بہن پولائن نے مرتے وقت آئینہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور جب اسے آئینہ پیش کیا گیا تو آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں اب بھی خوبصورت ہوں۔ اس لئے آئینہ دیکھنے کے بعد کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فطرت جو انتہائی حسین ہے اس پر کیا گزرتی ہوگی جب وہ اپنے حسن کو آئینے میں دیکھتا ہوگا۔ اقبال کا یہ شعر:

حسن آئینۂ حق، دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلامِ آئینہ

بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ کالی داس نے کیلاش پربت کی گود میں بسی ہوئی 'الکاپوری' کی تشبیہ عاشق کی گود میں بیٹھی ہوئی "کامنی" سے اور وہاں سے نکلنے والی گنگا کی دھار کی تشبیہ اس کامنی (یعنی الکاپوری) کے جسم سے ڈھلکی ہوئی ساڑی سے اور پھر الکاپوری پر بارش کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کے سایے کی تشبیہ کامنیوں کے سر پر موتی گتھے ہوئے جُوڑے سے دے کر الکاپوری کی نہ صرف خوبصورت تصویر کشی کی ہے بلکہ گنگا کی دھار، برستے ہوئے بادل اور بادلوں کے سایے کے اثرات اور موتی جڑے ہوئے کامنیوں کے جُوڑے کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام مناظر حرکت کرتے ہوئے آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ کالی داس نے الکاپوری کو کامنی سے تعبیر کر کے پہلے قاری کی جنسی تلذذ کو بیدار کیا اور پھر اس کے بدن سے اس کی ساڑی کو سرکا کر قاری کی جنسی خواہش کو بھڑکا دیا اور وہاں کے پوری فضا میں رومان اور سرمستی کی سی

کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ۶۷ ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

"ہے کام چارنی! اس کیلاش پروت کی گود میں الکا پوری ویسے ہی بسی ہوئی ہے جیسے اپنے پیارے کی گود میں کوئی کامنی بیٹھی ہو۔ وہاں سے نکلی گنگا جی کی دھارا ایسی لگتی ہے، مانو اس کامنی کے شریر پر سے سرکی ہوئی اس کی ساڑی ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایسی الکا کو دیکھ کر تم پہچان نہ پاؤ۔ اُونچے اُونچے بھونوں والی الکا پوری پر ورسا کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کامنیوں کے سر پر موتی گُتھے ہوئے جُوڑے جیسے چھائے رہتے ہیں۔"

(کالی داس۔گرنتھاولی، ص-۳۰۹)

اقبال نے ہمالہ کی رونق اور چمک کو ظاہر کرنے کے لیے اور آلودگی سے پاک وہاں کی ہواؤں کی اہمیت کو بتانے کے لیے اسے ہمالہ کا رومال قرار دیا ہے:

دامن موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

اسی نظم کے ایک اور بند میں شاعر نے فطرت کے حسین مناظر کی تصویر اس حسن وخوبی سے کی ہے کہ پہاڑ کی وادی میں نہ صرف حرکت پیدا ہوگئی ہے بلکہ محاکات کی عمدہ مثال بھی ہے جس سے وہاں کے تمام مناظر آنکھوں میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ ہمالہ کی وادی میں کالی گھٹاؤں کو گھڑ سوار، تیز ہوا کے جھونکوں کو گھوڑے اور بجلی کی چمک کو چابک سے تعبیر کر کے ہمالہ کی وادی کو بازی گاہ بنا دیا ہے جہاں فطرت کے عناصر ہمہ وقت مختلف کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں شاعر نے ہوا میں اڑتی ہوئی کالی گھٹاؤں کو اس مست ہاتھی سے جس کے پاؤں میں زنجیر نہ ہو سے تشبیہہ دے کر عجیب وغریب نظارہ پیش کیا ہے:

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

ایسے ہی نادر تشبیہات کالی داس نے بھی اپنی تخلیق میگھ دوتم میں بڑے آب وتاب سے استعمال کیے ہیں۔ پُروَ میگھ، شلوک ۲، میں کالی داس نے پہاڑ کی چوٹی سے لپٹے ہوئے بادل کی

تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی تشبیہ ہاتھی سے دی ہے۔ یکچھ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اساڑھ کے پہلے ہی دن وہ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے پہاڑی کی چوٹی سے لپٹا ہوا بادل ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہاتھی اپنے ماتھے کی ٹکر سے مٹی کے ٹیلے کو ہٹانے کا کھیل کھیل رہا ہو۔"

کالی داس نے ہوا کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے بادلوں کی تشبیہ مٹی کے ٹیلوں کو اپنے ماتھے سے مار مار کر ہٹانے کا کھیل کھیلتے ہوئے ہاتھی سے دے کر موثر انداز میں فطری منظر کشی کی ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے بادلوں کو فیلِ بے زنجیر کہا ہے اور پہاڑی علاقوں کو بازی گاہ یعنی کھیل کا میدان قرار دیا ہے جہاں فطرت ہاتھی اور گھوڑوں کا کھیل کھیلا کرتی ہے۔ ایک دوسرے بند میں صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اور ان جھونکوں کے اثرات سے پھولوں کی کلیوں پر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو انتہائی شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صبح کی ٹھنڈی ہواؤں نے کلیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ زندگی کے نشے میں ہر پھول کی کلی جھومتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ زندگی کے نشے میں پھول کی کلیوں کا جھومنا انتہائی لطیف خیال ہے:

جنبش موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی، ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی

مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسن نے بھی ایک باغ کا منظر اس طرح کھینچا ہے:

گلوں کا لبِ نہر وہ جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

کالی داس نے اپنی تخلیق رگھو ونشم میں موسمِ بہار کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی منظر کشی کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اچانک نوخیز منجری (flower of mango tree) سے بھرے آم کے پیڑ کی ڈالیاں، ہمالہ سے آتی ہوئی ہواؤں سے ایسی جھوم اٹھتی ہیں جیسے انہوں نے اداکاری سیکھنا شروع کر دیا ہو اور انہیں دیکھ کر حسد اور کدورت سے دور رہنے والے یوگیوں کا دل بھی جھوم اٹھا۔

(نواں سرگ، ۳۳واں اشلوک، ص-۸۱)

علامہ اقبال نے پودوں اور پھولوں کی پتیوں کو زبان سے تشبیہ دے کر ان کی خاموشی میں

قوتِ گویائی پیدا کر دی ہے اور تمام پھول یہ کہنے لگے ہیں کہ گلچیں کے ہاتھوں کی رسائی آج تک ان پھولوں تک نہیں ہو سکی:

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

اسی نظم کے ایک اور بند میں شاعر نے پہاڑ کی بلندی سے جو ندیاں راستے میں پڑے چٹانوں اور پتھروں سے ٹکراتی ہوئی نیچے آتی ہیں ان کی نہ صرف خوبصورت منظر کشی کی ہے بلکہ ان ندیوں کو جنّت کی ندیوں کوثر و تسنیم سے بہتر قرار دیا ہے۔ جس میں قدرت اپنے آپ کو دیکھتی رہتی ہے کہ اس کے مناظر کس قدر حسین ہیں ساتھ ہی ان ندیوں سے نکلنے والی آواز کو موسیقی سے تعبیر کیا ہے۔ ساتھ ہی راستے کے نشیب و فراز سے ٹکراتی ہوئی اور مسلسل اپنی منزلیں طے کرتی ہوئی ندیوں سے فلسفۂ زندگی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

وادیٔ کہسار کی شام کی منظر کشی کرتے ہوئے شام میں پھیلتی ہوئی سیاہی کو اندھیری رات کے زلفِ رسا سے تعبیر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلیٰ شب کوئی جیتی جاگتی دلہن ہو جس نے اپنے بالوں کو کھول کر اپنے حسن میں اضافہ کر لیا ہو اور اس حسین مناظر میں آبشاروں کی آواز دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ شاعر نے اس پرفریب شام میں چاروں طرف چھائی ہوئی خاموشی کو یہ کہہ کر: ''وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا'' شام کے وقت کی خاموشی کی اہمیت کو بڑھا دی ہے۔ عام طور پر رات کی خاموشی کو وحشت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اقبال نے اس کی اہمت کو justify کرنے کے لیے پیڑ پودوں اور درختوں پر چھائی ہوئی شام کی خاموشی کو فکری استغراق سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بند ملاحظہ کیجیے:

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

برف سے ڈھکی ہوئی ہمالہ کی چوٹیوں پر آفتاب کی پہلی کرن جب پڑتی ہے تو اس کا حسن دید کے قابل ہوتا ہے۔ اقبال نے اس حسین منظر کی نہ صرف تصویر کشی کی ہے بلکہ چوٹیوں کو 'سر' اور برف کو دستارِ فضیلت سے تعبیر کر کے ہمالہ کی اہمیت اور بڑھا دیا ہے:

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

اسی طرح غروب آفتاب کے وقت پہاڑوں پر پڑنے والے شفق رنگ اور اس سے ابھرنے والے مناظر کی تصویر کشی اقبال نے انتہائی خوبصورت انداز سے کی ہے:

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

شاعر نے شعر کے پہلے مصرعے میں رنگ شفق کو کانپتے ہوئے دکھا کر عجیب وغریب منظر پیش کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں شفق رنگ کو غازہ سے اور پہاڑ پر جمی ہوئی برف کو رخسار سے تعبیر کرنا انتہائی لطیف خیال ہے۔

اقبال نے جس طرح ہمالہ، گلِ رنگیں، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع اور بزمِ انجم وغیرہ نظموں میں فطرت کا مطالعہ پیش کیا ہے اور قدرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کی ہے اسی طرح نظم ''ابرِ کوہسار'' میں بھی فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے قدرت کے حسین مناظر کی بے حد خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تمثیلی اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے کوہسار کے بادل کو جاندار کی صورت میں پیش کیا ہے اور بادل کی زبانی اس کی تمام خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بادل کی وجہ سے پہاڑ کی وادیوں میں جو حسین مناظر نظر آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے۔

شاعر نے یہ کہہ کر کہ ابرِ کوہسار کے دامن میں چاروں طرف پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پہاڑ کی وادیوں کے ہرے بھرے گھاس کو مخمل کے بچھونے سے تشبیہ دے کر نہ صرف پہاڑ کی وادیوں کی حسین منظر نگاری کی ہے بلکہ ابرِ کوہسار کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا

کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

دراصل بارش کی وجہ سے ہی کسانوں کی کھیتی اور میدانوں کے سبزے لہلہاتے ہیں۔ لیکن اس بات کو کہنے کے لیے شاعر نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس بند کا پہلا مصرع ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُرافشاں ہونا
ناقۂ شاہد رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونق بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

دُرافشاں (یعنی موتی) بلبلے کا استعارہ بالکنایہ ہے۔ اس استعارے سے مصرعے میں جہاں حسن پیدا ہوا ہے وہیں بارش کے وقت کھیتوں اور میدانوں کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کالی داس نے میگھ دوتم میں ایک جگہ بارش کے دنوں میں بادل اور بادل سے لپٹے ہوئے قوسِ قزح (اندر دھنش) کی منظر کشی کی ہے اور اس کے ساتوں رنگوں کو قیمتی جواہرات سے تعبیر کیا ہے۔ اس رنگین فضا میں بادلوں کے سانولے رنگ کو کرشن جی کے چہرے کے رنگ سے اور اندر دھنش کے رنگوں کو کرشن جی کے تاج سے مشابہ قرار دے کر عجیب و غریب کیفیت پیدا کردی ہے۔ پندرہویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''دیکھو! سامنے سورج کی کانتی سے پربھاوِت میگھ اٹھا ہوا اندر دھنش کا وہ ٹکڑا ایسی خوبصورت دکھائی پڑ رہا ہے، جیسے بہت سے جواہرات کی چمک ایک ساتھ یہاں لا کر اکٹھی کردی گئی ہو۔ اس اندر دھنش سے سجا ہوا تمہارا سانولا جسم اتنا خوبصورت لگنے لگا ہے جیسے مور مکٹ پہنے اور گوالے کا بھیس بنائے ہوئے خود شری کرشن آ کھڑے ہوئے ہوں۔''

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔۳۰۱)

اس بند کے دوسرے مصرعے میں بادل کو شاہدِ رحمت اور ناقۂ حُدی خواں سے تعبیر کرکے بادل کی آواز کو نغمہ قرار دیا گیا ہے۔ جس کی تاثیر سے ریگستان میں اونٹ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور

اس طرح بادل کے گرجنے کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ کالی داس نے بھی بادلوں کے گرجنے اور اس کی گرجن سے ڈر کر محبوب کے آپس میں لپٹنے گلے سے لپٹنے کا بھی نقشہ کھینچا ہے اور بادلوں کی آواز کو دو چاہنے والے جوڑوں کے درمیان کی دوری ختم کرنے والا نغمہ قرار دیا ہے۔ ۲۳ ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

> ''اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اُوپر ہی اُوپر سے چونچ میں لے لینے چتر چاتکوں اور جھنڈ باندھ کر اُڑتی ہوئی چاتکیوں کو گناتے ہوئے سِدھ جن، جب تم وہاں پہنچ کر گرجنے لگو گے تو سِدھ ھانڈنائیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔ اس گھبراہٹ بھرے ہم آغوش کو پا کر وہ تمہارا احسان مانیں گے۔''
>
> (کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔۳۰۲)

اقبال کے اس بند کا یہ مصرع استعارہ بالکنایہ کی بہترین مثال ہے۔ اس بند کا یہ آخری شعر قابلِ توجہ ہے:

بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

اس شعر میں شاعر نے بادل کو گیسو سے تشبیہ دے کر اس سرزمین کو خوبصورت حسینہ بنا دیا ہے اور پھر گیسو کی رعایت سے یہ کہہ کر کہ بادل ''شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہے'' ہوا کو حسینہ کے کندھے سے تعبیر کیا ہے جو انتہائی بلیغ ہے۔ کیوں کہ ہوا کے تیز جھونکوں سے آسمان میں بادلوں کے بکھرنے اور پھر بکھر کر سنورنے کے منظر کی تصویر کشی اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں ممکن نہیں ہے۔

علّامہ اقبال نے اس سرزمین کو ایک دلہن قرار دیا اور کالے کالے بادلوں کو دلہن کے زلف سے تعبیر کیا ہے جو ہوا کے جھونکوں سے دلہن کے کندھوں پر کبھی بکھر جاتے ہیں تو کبھی سنور جاتے ہیں۔ کالی داس نے بھی میگھ دوت میں ایک جگہ کہا ہے کہ بادل جب ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر اُوپر اٹھے گا تو الکا پوری کی وہ تمام عورتیں جن کے شوہر ان سے دور ہیں اپنے لمبے بالوں کو اوپر اٹھا کے بڑے بھروسے سے تمہیں دیکھیں گی۔ کھلے ہوئے کالے بال گھنے بادلوں کی علامت ہے تو دوسری طرف یہ جدائی اور غم کی بھی علامت ہے۔

کالی داس نے ایک جگہ اور کالے کالے بادلوں کو کہیں نرم و نازک جُوؤں سے تو کہیں پہاڑوں میں پائے جانے والے جواہرات اور کہیں موتیوں سے بھرے ہوئے کامنیوں کے

جُوڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ کالی داس نے میگھ دوتم کے پہلے سرگ کے اٹھارہویں شلوک میں کہا ہے کہ پکے ہوئے پھلوں سے لدے آم کے پیڑوں سے گھرا ہوا آمر کوٹ پہاڑ پیلا ہوگا۔ اس کی چوٹی پر جب تم (بادل) نازک بالوں کی جڑوں کی طرح سانولا رنگ لے کر چڑھو گے تب وہ پہاڑی دیوتاؤں کی بیویوں کو دور سے ایسے دکھائی دے گا جیسے وہ زمین سے اٹھا ہوا ایسا جوبن ہو جس کے بیچ میں سیاہ اور چاروں طرف زرد ہو۔ اسی طرح ۶۷واں شلوک میں وہ کہتے ہیں کہ اُونچے اُونچے محلوں والی الکاپوری پر برسات کے دنوں میں برستے ہوئے بادل 'کامنیوں' کے سر پر موتی گتھے ہوئے جُوڑے کی مانند چھائے رہتے ہیں۔

تیسرے بند میں بھی بادل اور بارش کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس مضمون کو نئے انداز میں باندھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بظاہر شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادل کہیں برستا ہے اور کہیں نہیں برستا ہے۔ لیکن جہاں برستا ہے وہاں کے نہر کو بھنور کی بالیاں پہناتا ہے۔ دراصل پانی کی بوندوں سے نہر میں جو بھنور پیدا ہوتا ہے اسے شاعر نے بالیوں سے تعبیر کیا ہے۔ نہر کو گرداب کی بالیاں پہنانا صرف Poetic description ہے۔ اس مصرعے سے بھی بارش کی خوبصورت تصویر کھینچی گئی ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ کسی جگہ سے بغیر برسے ہوئے اگر بادل گزر جاتا ہے تو وہاں کے لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور بارش کے لیے ترسنے لگتے ہیں کیوں کہ بادل نوخیز سبزے کی امید ہے یعنی جو سبزہ ابھی ابھی زمین سے اگتا ہے وہ پانی کی کمی سے سوکھ جاتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی کا دارومدار بارش پر ہے۔ اس بند کے آخری مصرعے میں شاعر نے بادل کے بننے کی سائنسی وجوہات کی طرف روشنی ڈالی ہے۔ بند ملاحظہ کیجیے:

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

بندھیا پہاڑ کی چوٹی (جسے نیچ بھی کہا جاتا ہے) پر کھلے ہوئے کدمبھ کے پیڑ اور بادلوں کے دیدۂ امید کے خواہش مند، ان پیڑوں کی بے قراری اور اس پہاڑ کے غاروں سے خوشبودار اشیا سے نکلتی ہوئی خوشبو کو بھی کالی داس نے محسوس کیا ہے۔ وہاں کے بازارِ حسن کی عورتوں کے

ذریعے جنسی لذت حاصل کرتے وقت ان خوشبوؤں کا صحیح استعمال کیئے جانے کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ ۲۷ویں شلوک میں لکھا ہے:

"ہے متر! وہاں پہنچ کر تم تھکاوٹ مٹانے کے لئے 'نیچ' نام کی پہاڑی پر اُتر جانا۔ وہاں پر پھولے ہوئے کدمب کے پیڑوں کو دیکھ کر ایسا لگے گا کہ تم سے ملنے کے لئے ان کے روم روم پھڑ پھڑا اُٹھے ہوں۔ اس پہاڑی کی گپھاؤں میں سے ان خوشبودار اشیا کی خوشبو نکل رہی ہو گی، جنہیں وہاں کی رسک (عاشق مزاج) ویشیاؤں کے ساتھ ہم بستری کرنے کے وقت کام میں لاتے ہیں۔ اس سے تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ وہاں کے شہری کتنی آزادی سے جوانی کے مزے لیتے ہیں"۔

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔۳۰۳)

نروندھیا ندی کی اُچھلتی ہوئی لہروں اور ان لہروں پر کردھنی سی دکھائی دینے والی چڑیوں کی چہکتی ہوئی قطاروں کی تصویر کشی کے علاوہ رُک رُک کر بہنے والی لہروں اور ان میں پڑی ہوئی بھنور (گرداب) کو عورتوں کی ناف سے اور بل کھاتی ہوئی ندی کی لہروں کو عورتوں کی اداؤں سے تشبیہ دے کر کالی داس نے پورے منظر کو دلفریب بنا دیا ہے۔ ۳۰ویں شلوک میں لکھتے ہیں:

"ہے متر! اُجینی کی طرف جاتے ہوئے تم اُتر کر اس نروندھیا ندی کا بھی رس پی لینا، جس کی اُچھلتی ہوئی لہروں پر چڑیوں کی چہکتی ہوئی پنکتیاں کردھنی سی دکھلائی دیں گی۔ جو بہت خوبصورت ڈھنگ سے رُک رُک کر بہہ رہی ہوں گی اور اور اس میں پڑی ہوئی بھنور تمہیں اس کی نابھی جیسی دکھائی دے گی۔ کیوں کہ عورتیں ہاؤ بھاؤ کے ذریعے ہی اپنے محبوب کو محبت کی بات بتلاتی ہیں۔"

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔۳۰۳)

آخری مصرعے میں اقبال نے سائنس کے اس نقطے کو پیش کیا کہ سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اُوپر اڑتا ہے یہی بھاپ جب بہت اُوپر چلا جاتا ہے تو ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے اور یہی بادل ہوا کا دباؤ بڑھ جانے سے برسنے لگتا ہے۔ اسی لیے شاعر نے بادل کو سمندر کا بیٹا اور سورج کا پروردہ کہا ہے۔

آخری یعنی چوتھے بند میں بھی شاعر نے بادل کی فضیلت کو خوبصورت انداز میں بیان کی ہے جس سے پہاڑی علاقوں، پہاڑی ندیوں پہاڑ کے آس پاس کے میدانوں، ان میدانوں

میں کھلے ہوئے پھولوں اوراس علاقے میں بنے ہوئے جھونپڑوں کا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ساتھ ساتھ بادل کی اہمیت کا احساس اپنے قاری کو کرا دیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ پہاڑ کے جھرنوں میں سمندر جیسی جو ہلچل ہے وہ بادل نے عطا کی ہے۔شاعر نے یہ بتا کر کہ پرندے بادل کی آواز میں محو ہو جاتے ہیں، بادل کی آواز کو نغمہ قرار دے دیا ہے۔اس بند کے تیسرے مصرعے میں شاعر نے بادل کو حضرتِ عیسیٰؑ قرار دے دیا ہے یعنی جس طرح عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اسی طرح بادل بھی سبزے کو ہرے بھرے ہو جانے کے لیے حکم دیتا ہے۔شاعر آگے کہتا ہے کہ بادل صرف غنچوں کو کھلنا ہی نہیں سکھاتا بلکہ اپنی رحمت سے کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی خوشی پیدا کر دیتا ہے جو خوشی محلوں میں پائی جاتی ہے:

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

کالی داس نے آمر کوٹ کے جنگل اور جنگل میں کدمب کے پیڑ اور اس کے پھولوں کے علاوہ ان پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدل میں کھلے ہوئے کمل کے پھول، پتیوں اور ان پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن، زمین کی سوندھی خوشبو اور ان خوشبوؤں کو سونگھتے ہوئے ہاتھیوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جنگل میں ایک طرح کا ہلچل پیدا کر دیا ہے۔بائیسویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''اور پھر جس سمے تم پانی برساتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے اس وقت ادھ پکے اور ہرے پیلے کدمب کے پھولوں پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدلوں میں نئی پھولی ہوئی کمل کی پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن اور جنگلی دھرتی کی سوندھی خوشبو سونگھتے ہوئے ہاتھی تمہیں راستہ بتلائیں گے۔''

(کالی داس-گرنتھاولی، ص-۳۰۲)

بارش کی بوندوں کا انتظار نہ صرف پھولوں اور پودوں کو ہوتا ہے بلکہ آسمان میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو بھی ہوتا ہے۔بعض پرندے سواتی نچھتر پہلے بوند کو پی کر حاملہ ہوتے ہیں۔

کالی داس نے جھنڈ کے جھنڈ آسمان میں اڑتے ہوئے ان پرندوں کی بھی منظر کشی کی ہے جو بارش کی بوندوں کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنی چونچ میں روک لیتی ہیں۔۲۳ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

"اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اُوپر ہی اُوپر سے چونچ میں لے لینے چتر چاتکوں اور جھنڈ باندھ کر اُڑتی ہوئی چاتکیوں کو گناتے ہوئے سِدھ جن، جب تم وہاں پہنچ کر گرجنے لگو گے تو سِدھا نڈنا ئیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔"

(کالی داس۔گرنتھاولی،ص۔۳۰۲)

کالی داس نے پھولوں سے لدے ہوئے پہاڑ، پہاڑ پر بادلوں کے انتظار میں آنکھوں میں آنسو لئے کوئل اوران کی کُوک کی بھی منظر کشی کی ہے۔۲۴ویں شلوک میں لکھا ہے:

"ہے مِتر! میں جانتا ہوں کہ تم میرے کام کے لئے بغیر رُکے جلد جانا چاہو گے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ کُوٹج کے پھولوں سے لدے ہوئے ان خوشبودار پہاڑوں پر تمہیں رکتے ہوئے ہی جانا ہوگا کیوں کہ وہاں کے مور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر کر اپنی کوک سے تمہارا خیر مقدم کر رہے ہوں گے۔"

(کالی داس۔گرنتھاولی،ص۔۳۰۲)

الکانگری کے راستے میں پڑنے والے دشارن نام کے ایک دیش کے گلشن اور گلشن میں کھلے ہوئے پھول اور خاص کر کیوڑے کے سفید پھولوں سے آراستہ سفید گلشن کی تخلیق کی اور پھر ان کی تصویر کشی کی ہے۔وہاں کے گاؤں کے مندروں میں لٹکتی ہوئی چڑیوں کے گھونسلوں، وہاں کے جنگلوں میں پکی ہوئی جامنوں کے پیڑ اور باہر سے آئے ہوئے ہنسوں کی بھی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔۲۵ویں شلوک میں لکھا ہے:

"ہے مِتر! جب تم دشارن دیش کے پاس پہنچو گے تب وہاں کی پھولی ہوئی پھلواریاں پھولے ہوئے کیوڑے کی وجہ سے سفید دکھائی دیں گی۔گاؤں کے مندر کوّا وغیرہ چڑیوں کے گھونسلوں سے بھرے ملیں گے۔وہاں کے جنگل پکی ہوئی کالی جامنوں سے لدے ملیں گے۔اور ہنس بھی وہاں پر کچھ دنوں کے لئے آکر بسے ہوں گے۔"

(کالی داس۔گرنتھاولی،ص۔۳۰۲،۳۰۳)

اقبال کی نظم ''ہمالہ'' اور'' ابرِ کہسار'' اور کالی داس کی شاہکار ''میگھ دوت'' میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کالی داس نے اپنی اس بیانیہ نظم میں بادل کو اپنا پیغامبر بنا کر جہاں اپنی بیوی کے پاس اپنا پیغام بھیجا وہیں فطرت کا وسیع مطالعہ اور حسین منظر بھی پیش کیا۔ اقبال نے بھی اپنی ان دونوں نظموں میں کالی داس کی طرح بادل اور قدرت کے مناظر کا بیان جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے تخیل کی پرواز کس قدر بلند ہے۔

مناظر فطرت کا مطالعہ کی اہمیت آج کے دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ مہلک ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے ہو رہے ہیں اور انسانیت کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی توازن بگڑتا جا رہا ہے جس سے کائنات کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس لئے ایسے منصوبے بھی بنائے جا رہے ہیں جس سے کائنات کو محفوظ رکھا جا سکے اور فطرت کے لطیف و نازک حسن کو برقرار رکھا جا سکے۔ ان منصوبوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ دنیا کو پھر سے فطرت کے حسین مناظر کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ ان کے اندر کی درندگی ختم ہو جائے اور معصومیت پیدا ہو سکے ساتھ ہی میر کی طرح یہ محسوس کر سکیں کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت گام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

✠✠✠

عبادی کی شناخت

آفاق عالم صدیقی

کہا جاتا ہے کہ بڑا شاعر صرف معیار ہی میں نہیں مقدار میں بھی بڑا ہوتا ہے۔ اگر اس تناظر میں خالد عبادی کی شاعری پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مقدار کے معاملے میں وہ اپنے بہت سے ہم عصروں سے پیچھے ہیں۔ مگر یہ کوئی قابل توجہ بات نہیں ہے کیونکہ اردو زبان و ادب میں اگر خدائے سخن میر تقی میر کی مثال پائی جاتی ہے تو مرزا غالب کی مثال بھی پائی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عبادی کا سفر ابھی جاری ہے اس لئے مقدار کی کمی کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بعض ہم عصروں کی طرح نہ تو عجلت پسندی سے کام لیتے ہیں اور نہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں خود پر اور اپنی شاعری پر اعتماد ہے۔

''خوش اجاڑ'' عبادی کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے پہلے ''نہروں کا جال'' شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مجموعہ ہائے کلام کے درمیان نو سال کا فاصلہ ہے۔ ''نہروں کا جال'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا جبکہ ''خوش اجاڑ'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں میانہ روی پائی جاتی ہے۔ ایسی میانہ روی جو خود آ گاہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ خود آ گاہی کا ہی فیض ہے کہ عبادی اپنے تازہ پیش روؤں اور ہم عصروں کے درمیان خود افکار شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

خود افکاریت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ فنکار کو کسی بھی طرح کی آئیڈیالوجی کی پا گیری سے محفوظ رکھتی ہے اور آزادہ روی اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی فنکار

تب ہی خود مکتفی بنتا یا کہلاتا ہے جب وہ مانگے کے اجالے کی بجائے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں زندگی کو دیکھتا اور اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ ویسے خود مکتفی ہونا جتنا وجدانی یا وہبی ہوتا ہے اتنا ہی کسبی بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ فنکار کو بار بار اپنا محاسبہ کرنا پڑتا ہے کہ مبادا وہ جانے انجانے رائج تخلیقی روش کی طرف تو نہیں نکل آیا ہے یا وہ تخلیقی اظہار کے معاملے میں رائج بدعات کا تو شکار نہیں ہو رہا ہے؟ اس طرح تخلیق کاری کے عمل میں شعوری کاوش کا عمل دخل یقیناً بڑھ جاتا ہے، مگر یہ شعوری کاوش ایک خود آگاہ اور تربیت یافتہ تخلیقی ذہن کو آورد کی بو باس سے بچا لیتی ہے اور مجھے کہنے دیجئے کہ دراصل یہی چیز عبادی کی شاعری کا اختصاص ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے عبادی کو پتھروں پر چلنے والا شاعر قرار دیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عبادی ایسے شاعر ہیں جو شعور کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس پتھریلے سفر میں یقیناً اپنا توازن کھو دیتے۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ عبادی بنی بنائی روش سے گریزاں ایسے شاعر ہیں جو ادبی سرمائے سے توانائی تو حاصل کرتے ہیں مگر اسے سایہ دیوار کے طور پر استعمال نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انفعالیت کا احساس نہیں پایا جاتا۔ وہ تو کھلے طور پر کہتے ہیں کہ:

میں نئی بات کہوں اور نئے تیور سے
میری تنقید زیادہ ہو وکالت کم ہو

اس پر بس نہیں ہے، وہ دو قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں:

اپنی اپنی شمع جلاؤ
کب تک چاند اور چاند سا چہرہ

وہ داغ دل جو جھوٹے ہو چکے ہیں
انہیں دھونے کا موسم آ گیا ہے

ہم سے مت پوچھ ہماری بابت
گرچہ ہم نام و نسب رکھتے ہیں

عبادی کو چاند اور چاند سے چہرے کے مقابلے میں اپنی شمع زیادہ عزیز ہے۔ وہ ان تمام داغ ہائے دل کو بھی دھو ڈالنا چاہتے ہیں جو نئے موسم کے تناظر میں اپنی سچائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں محض نام و نسب کے حوالے سے پہچانیں۔ وہ خود

افکاریت کی روشنی میں آپ اپنی شناخت بنانا چاہتے ہیں، اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ادبی فضا فرسودگی سے پاک ہو جائے تاکہ فنکار آزادی سے سانس لے سکے اور وہ اپنے ہی حوالے سے پہچانا جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ عبادی ان چیزوں کو اپنی تخلیقی قوت اور فنکارانہ ہنر مندی سے نشانِ امتیاز کے طور پر قائم بھی کر دیتے ہیں۔

عبادی کی شاعری میں سیاسی بصیرت، عشق خود آگاہ کی عظمت، احترام آدمیت اور باغیانہ روش کی فرزانگی وشہزادگی کا احساس اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے:

اب مجھے بزم بشارت سے اٹھا
تیری آنکھوں میں دھواں رہتا ہے

یہ بندگی بھی نہیں رد بندگی بھی نہیں
دعا کو ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے

قطار انداز ہو جاؤ، نگاہیں پشت پا کر کے
عبادی آ رہا ہوگا ذلیل و خوار ہونے کو

بزم بشارت میں اتنی خود آگاہی کے ساتھ بیٹھنا کہ آنکھوں کا دھواں عیاں ہو جائے۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا اور دعا نہ کرنا اور پھر دربار میں آمد کو خواری سے تعبیر کرتے ہوئے لوگوں کو نگاہیں پشت پا کر کے قطار انداز ہو جانے کا حکم دینا ایسے خودشناس فنکار کا پتہ دیتا ہے جس کے مزاج میں شہزادگی رچی بسی معلوم ہوتی ہے ایسی شہزادگی جو احترام آدمیت، دیدہ بینا اور استغفا کے بغیر پیدا نہیں ہوتی ہے۔

ظفر اقبال صاحب کی شناخت کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نفعانی کیفیت کو مسترد کر کے توانائی کے ایسے لہجے کی پرورش کی جو ایک خاص طرح کی جارحیت کے ساتھ انہیں سے مختص ہو کر رہ گئی۔

عبادی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انفعانی کیفیت کو رد کر کے ایسے توانا لہجے کی پرورش کی جس میں جارحیت سے زیادہ مقانت پائی جاتی ہے۔ ان کو خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی طرح کے موضوع کے برتاؤ میں توازن قائم رکھتے ہیں۔ ویسے ان کی متانت ایسی قلندرانہ بے نیازی اور ایسی شجاعانہ بے پرواہی کی حامل معلوم ہوتی ہے گویا شاعر کو معلوم ہو کہ

اس کی ٹھوکر سے چشمہ آب حیواں پھوٹ پڑے گا۔

چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

کبھی آمادۂ وحشت کبھی مصروف سرتابی
قدم بوسی تو وہ کرتا ہے جسکے پاس فرصت ہے

مجھے دیکھو مثال دیگراں پر خاک وخس ڈالو
وگرنہ کچھ نہیں بچنے کا پھر دیدار ہونے کو

لٹتی رہی بہار رہ گل عذار میں
دل کو مگر دماغ فغاں تک نہیں دیا

وہ ہم سے دور ہے جب تک سفر ہے زندگی اپنی
کسی کے دشت ودریا سے ہمارا جی برا کیوں ہو

یہاں جو ایک خاص طرح کی توانائی اور خودشناسی کا احساس پایا جاتا ہے وہ عبادی کو شاعروں کی بھیڑ سے الگ کر دیتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ یہاں ذات کی نفی یا گمشدگی سے زیادہ ذات کے اثبات اور اس کے اقرار پر اصرار پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفعالیت کا نام ونشان بھی نہیں ملتا ہے اور نہ کسی طرح کی جھنجھلاہٹ اور جارحیت کا احساس پایا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بینا فنکار ہے جس کا سفر ازل سے ابد تک جاری ہے۔ سرتابی اور وحشت اسکے ضمیر میں شامل ہے۔ ایسے قدم بوسی کی فرصت نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر دیدار ضروری ہی ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا بھلا کون دید کے قابل ہے؟ یہ شاعر کی خود پرستی نہیں احترام آدمیت کی ایک مثال اور خود کو دریافت کرنے کی ایک کاوش ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ راہ میں حائل دشت ودریا سے بددل نہیں ہوتا ہے اور نہ بہار کے رہ گل عذار میں لٹنے فغاں کرتا ہے۔ گویا وہ تمام چیزوں کا رفرشناس ہے۔ شاید اسی لئے وہ بغیر کسی گلے شکوے کے برسرپیکار ہے:

پاس جو بھی ہو لٹا دیتا ہوں ہم جنسوں میں
میں گہنگار ہوں خیرات نہیں کرنے کا

ایسے لوگ اب کہاں ہیں اور کتنے ہیں جو اپنا سب کچھ لٹاتے وقت ضرورت مندوں کی لمبی قطار کو دیکھ کر خود کو گنہگار محسوس کرتے ہیں۔

دراصل انسانیت کی عظمت و حرمت کا پاس و لحاظ رکھنے والا یہی جذبہ عبادی کو زندگی کی راہوں پر ثابت قدمی سے چلنے کا حوصلہ بخشتا ہے اور وہ بڑی متانت سے کوچہ قاتل سے اپنے باغیانہ ذہن کو خوشبو کا احساس دلاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے راستے میں چشمہ آب حیواں بھی آتا ہے۔ کربلا کی جلتی ریت بھی ملتی ہے مگر وہ نہ تو منتقل ہوتے ہیں اور نہ سایہ دیوار کی جستجو کرتے ہیں۔ گو حوصلہ اور عزم سفر ہی ان کی زندگی ہے۔

خالد عبادی کی انفرادیت کا راز موضوع کے نئے پن میں نہیں موضوع کو برتنے کے سلیقے اور ندرت میں پنہاں ہے۔ ان کے یہاں ایسے موضوعات بھی گاہے بہ گاہے مل جاتے ہیں ۔جنہیں ان کے سینئر ہم عصر برت چلے ہیں۔ مگر ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ان موضوعات کا دوسرا رخ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سب کچھ نیا اور تازہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ ظفر اقبال صاحب کے یہ چند اشعار دیکھئے:

یہ کہیں ہوتے تو ظاہر بھی ہوا کرتے کبھی
دل سراسر واہمہ ہے اور دنیا خواب ہے

ہماری بے حسی کا رفتہ رفتہ اب یہ عالم ہے
کہ اب ہم پر خدا کی مار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

جب خاک اڑانا ہی تقدیر ہوئی اپنی
گھر میں اڑا لیں گے صحرا تو نہیں سب کچھ

خالد عبادی کہتے ہیں:

میں دل کی طرف دیکھوں تو دل کی طرف دیکھے
راہی تو وہی ہے جو منزل کی طرف دیکھے

شگفتِ گل سے پرندوں کی خوش نوائی تک
ہوں میں وہ شیر کہ جنگل مجھے جگاتا ہے

بہت ہیں چار دن یہ زندگی کے
کبھی رن میں کبھی گھر میں رہیں گے

ظفر اقبال صاحب یقیناً ہمارے عہد کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں اور بقول شخصے ظفرِ اقبال نے بہت سے تازہ کار شاعروں کو خراب کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو۔ مگر عبادی جیسے خود افکار شاعروں تک ظفر اقبال صاحب کے اثرات پہنچتے پہنچتے یا تو معدوم ہو جاتے ہیں یا پھر ان میں خرابی کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ظفر اقبال کے یہاں دنیا خواب اور دل واہمہ ہے۔ اس لئے زندگی کے ہنگامہ کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ عبادی کے یہاں دل ہی حاصل سفر اور منزل ہے۔ اس لئے میدان کار زار کا تصور زندہ ہے۔ ظفر اقبال کے یہاں بے حسی پر خدا کی مار پڑتی ہے۔ وہ بھی بیکار جاتی ہے۔ گویا خدا سے بھی جذبہ تحرک حاصل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ جبکہ عبادی کے یہاں خفتگی کو دور کرنے کے لئے شگفتہ گل سے لے کر پرندوں کی خوش نوائی تک مصروف کار ہے۔ یعنی رحمت یزداں کی بے کرانی آج بھی قائم ہے۔ ظفر اقبال صاحب کے یہاں گھر اور صحراء دونوں اپنی معنویت کھو چکے ہیں جبکہ عبادی کے یہاں گھر سلامت ہے۔ یہ گھر کی سلامتی ہی ہے جو "رن" میں برسرِ پیکار رہنے کا جواز پیدا کرتی ہے۔

میں یہاں پر ظفر اقبال صاحب اور عبادؔی کا تقابل کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں اور کر بھی کیسے سکتا ہوں کہ ظفر اقبال صاحب تقریباً اپنے مقام مقصود پر پہنچ چکے ہیں جب کہ عبادؔی ابھی راستے میں ہیں۔ ایک بات صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں نے یہاں ظفر اقبال کے اشعار محض اس لئے نقل کئے ہیں کہ جدیدیت کے بعد والے شعری رویے کی کسی حد تک شناخت ہو سکے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ آج کے شاعر کی سوچ اور اس کی فکر اپنے تازہ پیش رووں سے کس حد تک مختلف ہے۔ بقیہ شاعروں کے دو چار اشعار بھی اسی تناظر میں پیش کئے جاتے ہیں:

پھر سے بال و پر بنا لوں گا میں اپنی راکھ سے
پھر اٹھاؤں گا میں قصر ذات کو ڈھا کر کہیں

تو اگر تخت پہ یاسر متمکن ہوگا
سلطنت کے لئے تکریم کا ضامن ہوگا

ہم اپنے بھی پابند نہیں تھے کبھی یاسر
اٹھ آئے کہ دربار کے آداب بہت تھے

(خالد اقبال یاسر)

ہے کوئی خاک نہادوں کو جگانے والا
اس سے پہلے کہ قدم تندیٔ سیلاب رکھے

(ثروت حسین)

عبادی کہتے ہیں:

ہم خاک ہوئے تو بھی رہے خاک شفا ہی
مٹی میں ملانے کا ہنر کام نہ آیا

قطارِ انداز ہو جاؤ نگاہیں پشت پا کر کے
عبادیؔ آرہا ہوگا ذلیل و خوار ہونے کو

یہ لوگ بوسۂ دست ستم کو آئے ہیں
تو بڑھ کے کوئی ہمیں کیوں مٹا نہیں دیتا

سمندر میں جزیرے ہیں جزیروں پر ہے آبادی
ابھی اک شور بس کانوں سے ٹکرانے ہی والا ہے

سب سے پہلے یہ بات صاف کر دوں کہ ثروت حسین، اظہار الحق، افضال احمد سید اور خالد اقبال یاسر وغیرہ ان معنوں میں جدید شاعر نہیں ہیں جن معنوں میں ظفر اقبال، احمد مشتاق یا شہر یار وغیرہ۔

حالانکہ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدیدیت سے بغیر کسی بدگمانی کے انحراف کی راہ نکالنے والوں میں جو لگ اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ان میں ثروت و اظہار اور افضال و یاسر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے مشعری رویے کے تناظر میں انہیں بجا طور پر خود افکار شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ لوگ عبادیؔ سے سیف شاعر ہیں اور طرز احساس کی سطح پر ایک طرح کا اشتراک رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود عبادیؔ ان لوگوں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اشعار سے واضح ہے۔

خالد اقبال یاسر اپنی ذات کے گنبد کو ڈھاک کر اپنی راکھ سے بال و پر بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ گویا وہ ذات کے گنبد میں بند رہنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ مگر ان کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی خاکستری بذات خود اکسیر نہیں بن سکی ہے۔ اس لئے اسے

تغیر کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جبکہ عبادی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خاک ہو کر بھی اپنی تاثر نہیں کھوتے ہیں اور خاک شفا بن کر اپنی انفرادیت قائم کر لیتے ہیں۔

یاسر خود کو سلطنت کی تکریم کا ضامن سمجھتے ہیں۔ یعنی سلطنت کے بغیر یاسر اور یاسر کے بغیر سلطنت قابل تکریم نہیں رہ جاتی ہے۔ مگر عبادی کا معاملہ یہاں بھی الگ ہے کہ جب وہ ذلیل وخوار ہونے کو آتے ہیں تب بھی لوگوں کو۔ نگاہیں پشت پا کر کے قطعار انداز ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ ہر حال میں قابل تکریم ہیں۔ یہ ہے کہ احترام آدمیت کے اظہار کا وہ سلیقہ جوان کے ہم عصر ہی نہیں پیش روؤں میں بھی بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ یاسر دربار کے آداب سے بددل ہو کر آپ ہی اٹھ آتے ہیں۔ جبکہ عبادی بوسۂ دست ستم کے لئے آئے ہوئے لوگوں کی بھیر کے لئے آزمائش بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی سرتابی کے باوجود بوسۂ دست ستم کو آئے لوگوں کی بھیڑ انہیں وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہیں کر پاتی ہے۔ عبادی کا ایک اور شعر ہے:

اب مجھے بزم بشارت سے اٹھا
تیری آنکھوں میں دھواں رہتا ہے

لیکن انہیں بزم بشارت کون اٹھائے کہ وہ تو ایسے واقف اسرار شاعر ہیں کہ ان کے اٹھتے ہی بزم بشارت برہم ہو جائے گی۔ لیکن ثروت حسین صاحب خاک نہادوں کے لئے فکرمندی کا اظہار تو کرتے ہیں مگر انہیں بیدار کرنے کے لئے خارجی سہارا تلاش کرتے ہیں۔ یعنی خاک نہادوں کی حفاظت کا جو ایک موقع ہے اسے بھی گنوائے دے رہے ہیں۔ عبادی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں یا تو کوئی موقع ہی نہیں ہوتا یا پھر انسانیت کو بچانے کا کوئی موقع ہوتا ہے تو پھر وہ کسی کی بھی پروا کئے بغیر میدان کارزار میں اتر جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے دوسرے شاعروں کا عبادی کے ساتھ محض اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ نئی نسل کی انفرادیت کا کسی حد تک احساس ہو سکے۔

عبادی کے یہاں بسا اوقات ہلکے پھلکے جذباتی قسم کے اشعار بھی نظر آ جاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی ان کے لہجے کی توانائی اور ان کا خلوص قاری کو باندھ لیتا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

یا ان پہ چھپٹ باز کبھی ہیں پالتو جن کے
یا ہاتھ میں تھامی ہوئی تلوار گرا دے
کیا ایک بھی ہم میں وہ تیر انداز نہیں ہے
جو سرخ پہروں والا یہ بمبار گرا دے

عبادیؔ نے اپنی کتاب کا نام ''خوش اجار'' رکھا ہے اور پیش لفظ ''الجرا'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جن میں اس کتاب کی حد تک فلسطین کو حسن اور عراق کو عشق متصود کرنے کی گزارش کی ہے اور کتاب لیلیٰ خالد کے نام معنون کی ہے۔ اس اہتمام والتزام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ''خوش اجار'' کی حد تک ایک خاص طرح کی شاعری کے جویا ہیں۔ مگر عبادیؔ جیسے شاعر کو محدود کر کے دیکھنا کسی بھی طور پر مناسب نہیں ہوگا کہ لیلیٰ خالد یوں بھی ایک بلیغ استعارہ بن جاتا ہے، ان تمام قدروں اور عزیز چیزوں کا جس سے شاعر کو عشق ہے یا ہو سکتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جس مبارز طلبی کی صفت سے عبادیؔ کی شاعری متصف ہے اسی مبارز طلبی کی تجسیم کا نام لیلیٰ خالد ہے۔ اس طرح فلسطین وسیع معنی میں جدو جہد آزادی کا حسن ہے جب کہ عراق اس حسن پر نچھاور ہو جانے والا عشق۔ یہ بات ہم سبھی جانتے ہیں کہ دراصل حسن نام ہے خیر کا اور عشق نام ہے اس پر مر مٹنے کا۔ اس طرح کہا جانا چاہئے کہ عبادی کی شاعری میں رزمیہ لحن پایا جاتا ہے وہ دراصل حق و باطل کی ازلی کشمکش کا پروردہ ہے۔ بھلے اسے آپ کسی بھی تناظر میں دیکھیں۔ یہ چند اشعار دیکھئے:

بڑھاؤں ہاتھ جب میں تشنہ لب اس جام کی جانب
تری شمشیر گویا ہو کہ یہ جام شہادت ہے

کوئی گولی کلیجہ ڈھونڈتی ہے پار ہونے کو
میں اپنے طور پر قائم ہوں خوش اجار ہونے کو

ریگستان عرب میں عجم کے شجرستان
پھول ہے آتش زیرپا سیرابی میں

سرخ روئی کے لیے کچھ کم نہیں ہے قتل گاہ
جام میں کیا ہے کہ ہم اس جام کے ہو جائیں گے

کوئی بجلی نہ چمکے گی کوئی شعلہ نہ لپکے گا
اگر تم قتل کرتے ہو اگر میں سر جھکاتا ہوں

ان اشعار میں رزمیہ لحن کی جو گونج ہے، سر دلی کا جو جذبہ ہے اور مبارز طلبی کی جو فضا ہے

وہ آج کے بہت کم شاعروں کے یہاں دیکھنے کوملتی ہے۔

غزلیہ شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ یہ حسن وعشق کی فضا سے باہر زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکتی ہے۔ حسین الحق صاحب نے کلیم صاحب کا دفاع کرتے ہوئے اپنے حالیہ مضمون ''ادب میں اقدار کی باتیں'' میں لکھا ہے کہ:-

> ''غزل کے بنیادی موضوع کو سامنے رکھا جائے تو اعتراف کرنا ہوگا کہ اس کا بنیادی موضوع عشق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا، اور عشق بنیادی طور پر وحشی جذبہ ہے۔ جس میں عاشق ومعشوق دونوں کسی دوسرے کے بارے میں نہیں سوچتے ہیں۔ ان کا مرکز نظر ان کی اپنی ذات ہوتی ہے۔''

اب ظاہر ہے کہ جب عاشق ومعشوق کا مرکز نظر ان کی اپنی ذات ہوتی ہے تو اس کا اظہار بھی وہ اپنی ہی ذات کے جملہ صفات کے ساتھ کرے گا۔ سو جس کی ذات جس معیار یا جس طرح کے لحن کی حامل ہوگی اس کا اظہار بھی اسی پائے کا ہوگا۔ ویسے یہ بات بھی بارہا کہی جاچکی ہے کہ اچھا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کا رمز دریافت کرتا ہے۔ اب اگر اس تناظر میں عبادی کے یہاں جو خالص عشقیہ نوعیت کی شاعری پائی جاتی ہے اس پر توجہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں عشقیہ لحن میں بھی ایک طرح کی جی داری ہے۔ زندگی کے نغموں کی جھنکار ہے، اپنی ذات اور اپنی ذات کے حوالے سے انسانی وجود کی عظمت وحرمت کا قد بلند رکھنے کی ایک شجاعانہ کوشش ہے:

سناؤ حال دل بے قرار وحشی کو
کہ اس کے پاس مداوائے رائیگاں بھی نہیں

سر شوریدہ سے پونچھوں لہو میں کیا جب تک
یہاں جو جمع ہیں پتھر ہٹا نہیں دیتا

لکھا خنجر سے تیرا نام دل پر
ہمیں آتی نہیں دیوانگی بھی

ہمارا نام مت لے اور یہ بتلا بھی دے ہم کو
محبت کس کو آتی ہے محبت کون کرتا ہے

غبار ہجر میں گزری تمام ساعت قرب
وصال زہر نہ کھاتا تو اور کیا کرتا

کبھی تو آگ پہ چلنا ہو پھول پہ چلنا
کبھی تو اس سے بچھڑ کے مجھے قرار ملے

اردو کی عشقیہ شاعری کے تناظر میں ان اشعار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ روایتی منفعل عاشق کے برعکس یہاں عاشق کا جو تصور ابھرتا ہے وہ بہت ہی جی دار قسم کا ہے، یہی وجہ ہے کہ لب و لہجے میں بھی ایک خاص طرح کی توانائی درآئی ہے۔ اشعار پڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی عام آدمی کا نہیں ایک بڑے آدمی کا عشق ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں عشق روگ نہیں بنتا ہے۔ آگ بن جاتا ہے، زندگی کی توانا آگ، فراق صاحب نے بہت پہلے کہا تھا کہ دنیا کے بڑے بڑے عاشق کا عشق بھی بڑے آدمی کے عشق کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بڑا آدمی ناک نہیں رگڑ سکتا۔ وہ نالہ و شیون نہیں کر سکتا۔ ہاں ایک قدر کی طرح اسے اپنی زندگی کا حصہ ضرور بنا لیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عبادی کے یہاں بھی عشق ایک قدر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ پتھر ہٹانے کے بجائے سر شوریدہ سے لہو پونچھنے بیٹھ جاتے کہنے کا مطلب یہ کہ جو چیزیں دوسروں کا یہاں الفعالیت کا سبب بن جاتی ہے وہ چیزیں بھی عبادی کے یہاں محترک کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

''خوش اجاز'' کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ عبادی کی شاعری کا مجموعی آہنگ مبارز طلبی کا آہنگ ہے، یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ مبارز طلبی ہی کے آہنگ سے اظہار الحق، افضال احمد سید، ثروت حسین اور خالد اقبال یاسر وغیرہ کی شاعری کی فضا تخلیق ہوئی ہے ان کی شاعری میں اور عبادی کی شاعری میں کیا فرق ہے؟

جواب بہت آسان ہے، کیونکہ فرق بالکل واضح ہے۔ ان لوگوں کے یہاں مبارز طلبی کا جو احساس پایا جاتا ہے وہ داستانوی رنگ کا حامل ہے۔ جبکہ عبادی کے یہاں مبارز طلبی کا جو احساس پایا جاتا ہے وہ رزمیہ لحن کا حامل ہے۔

میرا خیال ہے کہ رزمیہ لحن کی خوبی ہی سے متاثر ہو کر احسن مفتاحی صاحب نے عبادی کو مومن شاعر قرار دیا تھا۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو چار اشعار پیش کرنا چاہوں گا کہ ان اشعار سے سرسری گزر جانا آسان نہیں ہے:

خنجر سے کچھ لکھتا رہتا ہوں تن پر
یا اک باب اضافہ ہے خوں نابی میں

جاؤ کہ سر جھکا ہے گھر کا
ماں بھی زبان دے رہی ہے

فلک اندیشہ زیر قدم سے دور تھا پہلے
ہماری خاک پا میں جرأت پرواز حیرت ہے

ایک ہی چھت کے نیچے چاروں وحشی کیا بیٹھے
داناؤں نے سمجھا کوئی سازش ہوتی ہے

جھک کر میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں مٹی میں
طے کرنا کچھ سہل نہیں ہے جلدی میں

عبادیؔ کی شاعری سے متعلق تمام باتوں کو سمیٹتے ہوئے اختصار سے کہنا ہو تو کہا جائے گا کہ عبادیؔ ایک ایسے تیکھے فرد کے طور پر سامنے آتے ہیں جو ہر طرح کی محدود اور ضابطہ بند سیاسی وسماجی اور معاشرتی سنگینی کی فضا سے ماورا ایسے تضاد کا ذکر کرتے ہیں جو انہیں اپنے عہد میں بے چین اور برگشتہ رکھتا ہے۔ عزم واستقلال اور برگشتگی کا یہی تیکھا انداز ان کی شناخت ہے اور رزمیہ آہنگ ولحن ان کی شاعری کی جان ہے:

سینے کے لئے نیزہ و خنجر کی مسرت
دنیا کے بڑے سے بھی بڑے سکھ سے بڑی ہے

☩☩☩

سلام بن رزاق سے کچھ افسانوی ادب پر گفتگو

نثار احمد صدیقی

نثار : ــــ کیا مابعد جدیدیت بھی ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی طرح کسی تحریک سے متاثر ہے۔ اگر نہیں تو یہ کون سا رجحان ہے جو جدت پسند ادیبوں کو اندھیرے گپھاؤں میں سمیٹے جا رہا ہے؟

سلام بن رزاق : ــــ ترقی پسندی ایک تحریک تھی اور جدیدیت اس کے ردعمل میں ایک رجحان کے طور پر سامنے آئی۔ میری دانست میں مابعد جدیدیت نہ کوئی تحریک ہے نہ رجحان بلکہ یہ ایک Phenomena ہے، جو جدیدیت کے بعد پیدا ہونے والی سماجی، ثقافتی اور ادبی صورت حال کو انگیز کرنے پر زور دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت پر پچھلی دو دہائیوں سے طول طویل مباحث کا سلسلہ جاری ہے تاہم اب تک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ جدیدیت کے بعد والے عہد کو کیا نام دیا جائے۔ جو بھی ہو اگر اس عہد کو ''مابعد جدیدیت'' کا نام دیا بھی جائے تو یہ کہنا غلط ہے کہ آج کا ادب اپنی ذات کی اندھیری گپھاؤں میں سمٹ رہا ہے۔ نیا شاعر اور ادیب، اجنبیت، قنوطیت اور تنہائی کے کرب والی کیفیت سے باہر نکل کر کھلی فضا میں سانس لینے کی کشاکش سے دوچار ہے۔

نثار : ــــ کل کا قاری جدید ادیبوں کی زبان اور اسلوب میں اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ ایسا کیوں؟ اگر یہ ادیب واقعی اپنے عہد کا نمائندہ ہوتے تو قاری ان کے مافی الضمیر کے قریب بہ آسانی پہنچ جاتا؟

سلام بن رزاق : ــــ اول تو یہ سمجھنا غلط ہے کہ جدیدیت کے عہد میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب

قابل اعتنا ہے۔ فلسفہ وجودیت کے شکار چند ہیئت پرستوں نے ایک مختصر مدت کے لئے مغرب کی تقلید میں افسانے کو چیستاں ضرور بنا دیا تھا جس کی وجہ سے افسانہ زندگی کی صالح اور مثبت قدروں سے کٹ گیا اور اردو کا قاری افسانے سے یوں ڈرنے لگا جیسے سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے۔ مگر یہ شعبدہ گری زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ خود جدید افسانہ نگاروں نے بھی بہت جلد اپنی اس شدت پسندی کو محسوس کر لیا اور وہ دوبارہ نئے سماجی، ثقافتی اور ذہنی تناظرات میں افسانے لکھنے پر مجبور ہوئے۔ ثبوت کے لئے جدیدیت کے نمائندہ اور مقبول افسانہ نگار سریندر پرکاش کے آخری ایام کے افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

نثار: —— کیا جدید افسانوں میں جو علامتی اور تجریدی رجحان آیا تھا وہ ختم ہو گیا یا ابھی بھی باقی ہے۔ اگر باقی ہے تو آپ اپنی رائے تفصیل سے دیں؟

سلام بن رزاق: —— ادب میں علامتوں اور استعاروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ہمارے آسمانی صحائف، ہمارا کلاسیکی ادب، شاعری، داستانیں، حکایتیں اور قصے کہانیاں سب علامتوں اور استعاروں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ علامت اور استعارہ تخلیق کو ایک نیا زاویہ، نیا تناظر عطا کرتے ہیں۔ اس کے معنی اور مفہوم کو ابھار کر روشن کرتے ہیں۔ شرط یہی ہے کہ انہیں سلیقے سے برتا جائے۔ علامت باہر سے دیوار میں میخ ٹھونکنے جیسا عمل نہیں ہے۔ علامت تخلیق کے بطن سے پھوٹتی ہے اور فن پارے کو کسی چھتنار درخت کی طرح سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔

نثار: —— جدید ادب خصوصاً افسانوی ادب مغربی ادب سے کس حد تک متاثر ہے؟

سلام بن رزاق: —— جدید ادب، مغربی ادب سے ابتدا ہی سے متاثر رہا ہے بلکہ اس کا جنم ہی مغرب کی تقلید میں ہوا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہاں جو تحریکیں یا رجحانات اپنے عروج پر پہنچ کر معدوم ہونے لگتی ہیں تب ہمارے یہاں ان کی بازیافت ہوتی ہے۔ جدیدیت، وجودیت، تجریدیت، سرئیلیزم، اسٹریم آف کانشس نیس، ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت، یہ ساری تحریکیں یا رجحانات نیز ہیئت اور اسلوب کے تجربے سب میں ہم ہمیشہ مغرب کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ کوئی ایک تحریک یا رجحان یا میلان ایسا نظر نہیں آتا، جس پر مغرب کی چھاپ نہ ہو، حتیٰ کہ "دلت ادب" بھی جس کے خالص ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ بھی امریکہ کے "بلیک پینتھرس" تحریک سے متاثر ہے۔ رہی مختصر افسانے کی بات۔ اگرچہ ہمارے یہاں "کتھا کہانی" کی روایت بہت قدیم ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم نے مختصر افسانے کا موجودہ فارم مغرب ہی سے مستعار لیا ہے۔

نثار: —— آج کے زیادہ افسانہ نگاروں نے افسانے کی تکنیک کو بدل دیا ہے۔ آپ اس سے کہاں تک متفق ہیں؟

سلام بن رزاق: —— اردو مختصر افسانے کی تاریخ سو سوا سو برس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس عرصے میں عہد بہ عہد افسانے کی تکنیک میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ابتدا میں رومانی افسانے، پھر پریم چند کے حقیقت پسندانہ مقصدیت سے پر اور اصلاحی افسانے، اس کے بعد ترقی پسند افسانے، پھر جدید افسانے، اور پھر مابعد جدید یا اس سے بھی آگے جدید تر افسانے۔ ہم بغور دیکھیں تو ہر عہد کا افسانہ تکنیک اور فارم کی سطح پر ماقبل افسانے سے کہیں نہ کہیں مختلف ضرور نظر آتا ہے۔ کسی بھی صنف میں ہیئت یا تکنیک کی تبدیلیاں راتوں رات وقوع پذیر نہیں ہوتیں۔ یہ ادب میں دھیرے دھیرے نفوذ کرتی ہیں۔ جس میں ہمارے طرز احساس کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ البتہ جدیدیت کے عہد میں افسانے کی تکنیک میں کافی توڑ پھوڑ مچائی گئی تھی۔ بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں نے اس نے اس کے مثبت اثرات کو قبول کیا اور باقی کو رد کر دیا۔

نثار: —— دس سالوں کے اندر ہندو پاک میں کئی ناولیں منظر عام پر آئے ہیں۔ کیا ان ناولوں میں کوئی ایسا ناول ہے جو "آگ کا دریا"، "خدا کی بستی" اور "اداس نسلیں" کے مدمقابل ہوا، اگر ہے تو اس ناول کی خوبیاں بیان کریں؟

سلام بن رزاق: —— پچھلے بیس پچیس برسوں میں معاصر قلم کاروں کے کئی ناول منظر عام پر آئے جن میں عبدالصمد کا "دو گز زمین"، پیغام آفاقی کا "مکان"، الیاس احمد گدی کا "فائر ایریا"، سید محمد اشرف کا "نمبردار کا نیلا"، مشرف عالم ذوقی کا "پوکے مان کی دنیا" اور ادھر رحمٰن عباس کا ناول "ایک ممنوعہ محبت کی کہانی" قابل ذکر ہیں۔ یہ ناولیں موضوع اور مواد کے اعتبار سے اپنے عہد کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر انہیں ابھی "آگ کا دریا"، "خدا کی بستی" اور "اداس نسلیں" کے مقابل رکھ کر دیکھنا قبل از وقت ہوگا۔

نثار: —— الیاس احمد گدی کا ناول "فائر ایریا" اور حسین الحق کا "فرات" سے متعلق آپ اپنا خیال ظاہر کریں اور یہ بتائیں کہ ان دونوں ناولوں میں کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں؟

سلام بن رزاق: —— اظہار خیال کے لئے صرف "فائر ایریا" اور "فرات" ہی کیوں؟ بہر کیف میرے نزدیک دونوں ناول اپنے عہد، ماحول اور معاشرے کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ "فرات" بھی دراصل جدید معاشرے کی یلغار میں گم ہوتی صالح قدروں کی المنا کی کا بیان ہے اور "فائر ایریا" کی کہانی کوئلوں کی اس کالی دنیا کی داستان ہے جسے عرف عام میں "کول فیلڈ"

کہتے ہیں۔ میرے نزدیک "فائر ایریا" اردو ناولوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول نہیں آگ کا گولہ ہے جس میں انسان کی ہزاروں برس کی تہذیب خس وخاشاک کی طرح جل کر بھسم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ میں نے "فائر ایریا" پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جو رسالہ "تکمیل" میں شائع ہوا تھا۔ رفیعہ شبنم عابدی کی مرتب کردہ کتاب "معاصر ناول" میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔

نثار : ـــــ کیا آج بھی ایسا افسانہ لکھا جارہا ہے جو روایت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اپنے عصری تقاضوں کا فنکارانہ اظہار ہو اور کیا اسے جو مقبولیت حاصل ہے اسے باقی رہنا چاہئے یا نہیں۔ اپنی ذاتی رائے دیں؟

سلام بن رزاق : ـــــ یقیناً آج بھی ایسے افسانے لکھے جارہے ہیں جو افسانے کی صحتمند روایت سے مربوط بھی ہیں۔ اس سے الگ اپنی شناخت بھی رکھتے ہیں۔ یہاں فہرست سازی کا محل نہیں ورنہ معاصر افسانہ نگاروں کے ایسے درجنوں افسانوں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔

نثار : ـــــ جدید اور ترقی پسند کہانیوں میں ہم کس طرح امتیاز برت سکتے ہیں۔ امتیازی اوصاف کی روشنی میں آپ اپنی کہانیوں سے متعلق کیا کہنا چاہیں گے؟ تفصیل سے جواب دیں۔

سلام بن رزاق : ـــــ جدید اور ترقی پسند افسانوں کے امتیاز اور افتراق پر ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اپنی کہانیوں کے تعلق سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ میں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی صالح ادبی روایتوں سے کسب فیض کیا ہے اور اپنی ایک الگ شناخت بنانے کی کوشش کی ہے۔ روسو کا مشہور قول ہے کہ "میرے مزاج اور کردار کی تعمیر ان لوگوں میں سے کسی کے نمونے پر نہیں ہوئی جنہیں میں جانتا ہوں۔ اگر میں ان سے بہتر نہیں ہوں تو کم از کم مختلف ضرور ہوں۔" اس مقولے کی روشنی میں میرے افسانے اپنے پیش رووں سے کتنے اور کیسے مختلف ہیں اس پر میرے افسانوں کے باشعور قارئین ہی صحیح معنی میں غور کرسکتے ہیں۔

نثار : ـــــ ہندوپاک کے مشہور اور جدید افسانہ نگار بلراج مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، رشید امجد، انور سجاد، شوکت حیات، احمد یوسف اور حسین الحق کے متعلق اپنے چند ٹھوس تاثرات پیش کیجئے؟

سلام بن رزاق : ـــــ اس سوال کا جواب ایک طویل مقالے کا متقاضی ہے۔ ان میں شوکت اور حسین الحق میرے معاصر ہیں۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ان دونوں کے افسانوں پر تجریدیت اور ابہام پرستی کا سایہ تھا مگر بہت جلد دونوں تجریدیت اور ژولیدہ بیانی سے کنارہ کش

ہو گئے اور دوبارہ کہانی پن کی طرف رجوع ہوئے اور چند عمدہ اور خوبصورت کہانیاں لکھیں۔

نثار: —— اردو ادب میں کون سی صنف سب سے زیادہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور کیوں؟

سلام بن رزاق: —— پچھلے چند برسوں سے پورے ادب میں ایک 'ٹھہراؤ' سا آ گیا ہے۔ آج صارفیت، پاپولر کلچر ماس میڈیا، اقدار کی شکست و ریخت اور تہذیبی انتشار سنجیدہ ادب کو کسی اجگر کی طرح دھیرے دھیرے نگلتا جارہا ہے بلکہ نگل چکا ہے۔ اب تو لوگ باگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ آخر ادب کی ضرورت کیا ہے؟ اسے کیوں پڑھا جائے؟ بقول قرۃ العین حیدر "دنیا روز بروز مشکل تر ہوتی جارہی ہے۔" اس مشکل تر دنیا میں اگر کوئی ادب تخلیق کررہا ہے تو سمجھئے صحرا سے چشمہ نکال رہا ہے۔ ویسے اگر پچھلے تیس چالیس برس کے ادب پر نگاہ ڈالیں تو محسوس ہوگا کہ شاعری کے مقابلے میں "افسانہ" زیادہ تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ البتہ جو تنقید لکھی جارہی ہیں اس میں تحسین سے زیادہ تنقیص اور خلوص سے زیادہ بقراطیت اور خود پسندی کا غلبہ نظر آتا ہے۔

نثار: —— عصمت چغتائی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "سریندر پرکاش کی کہانی "بجوکا" پریم چند کے مشہور ناول "گئودان" کے ایک کردار سے اخذ ہے اور اسے ایک نئے عصری زاویئے سے پیش کیا گیا ہے۔" آپ اس جملے کے متعلق کیا کہنا چاہیں گے؟

سلام بن رزاق: —— عصمت چغتائی کی رائے اپنی جگہ درست ہے، مگر مشہور نقاد باقر مہدی اس کہانی کو دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک معمولی کہانی ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں "یہ ہوری نامی ایک کسان کی کہانی ہے جس کا بجوکا غاصب بن گیا ہے اور بس۔"

نثار: —— رام لعل نے ہندوپاک کے مشہور افسانہ نگار بلراج مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، رشید امجد اور شوکت حیات کے متعلق کہا ہے کہ "یہ سب مہمل افسانہ نگار ہیں۔" آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا رام لعل نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے، اگر نہیں تو پھر آپ بتائیں؟

سلام بن رزاق: —— رام لعل کی رائے انتہا پسندی کی مثال ہے۔ انہوں نے جن افسانہ نگاروں کے نام گنوائے ہیں ان کے یہاں مہمل نگاری کی مثالیں تو ملتی ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کے پورے فن کو یکسر قلم زد کر دینا زیادتی ہے۔

نثار: —— کلام حیدری نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "قرۃ العین حیدر سے صرف ایک گلہ ہے کہ وہ ایک بزدل خالق ہیں اور جہاں پر معاملہ جنس کا آتا ہے، اسے یا تو پھلانگ جاتی ہیں یا کنارے کنارے نکل جاتی ہیں۔" آپ نے قرۃ العین حیدر کے ناول کہانیاں، یقیناً پڑھا ہوگا۔ آپ کو کلام حیدری کے جملہ میں کتنی صداقت نظر آتی ہے۔ تفصیل سے جواب دیں؟

سلام بن رزاق: — قرۃ العین حیدر اردو کی عہد ساز ادیبہ ہیں۔ انہوں نے اتنا لکھا ہے کہ اسے صرف پڑھنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔ انہوں نے جنس پر کھل کر نہیں لکھا اس لئے انہیں ''بزدل خالق'' کہنا سراسر غلط ہے۔ جنس کبھی بھی ان کے افسانوں یا ناولوں کا موضوع نہیں رہا۔ آخر کلام حیدری کو یہ اصرار کیوں تھا کہ انہیں جنس پر کھل کر لکھنا چاہیے؟ مجھے تو اس ریمارک کے پردے سے خود ریمارک دینے والے کی حسرت جھانکتی نظر آتی ہے۔

نثار: — آپ اپنی چند اچھی کہانیوں کے بارے میں بتایئے؟ آپ کی کہانیوں میں کون سی خوبیاں ہیں؟

سلام بن رزاق: — میری کہانیوں پر کئی نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ میں خود اپنی کہانیوں کی خوبیاں بیان کروں یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

نثار: — جب تجریدیت کا غلغلہ تھا تب افسانے پر یہ الزام ایک حد تک درست تھا۔ کیونکہ واقعتاً بعض تجریدی افسانوں کو دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ یہ نثری نظم ہے یا کوئی انشائیہ ہے مگر اب ایسی صورت حال نہیں ہے۔

نثار: — بول چال کی سطح پر یوں تو اردو کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، لیکن تلفظ کا معیار دن بہ دن خراب ہو رہا ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟

سلام بن رزاق: — تلفظ کا تعلق زبان کے علاوہ علاقے سے بھی ہوتا ہے۔ بہت سے علاقوں میں لوگ باگ 'ش' کو 'س' بولتے ہیں۔ بعض علاقوں میں 'ڑ' کو 'ر' کہتے ہیں۔ کہیں 'ق' کو 'خ' کے تلفظ سے بدل دیا جاتا ہے۔ اس لئے تلفظ کا معیار ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود درس گاہوں میں اساتذہ کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

نثار: — اردو کے فروغ کے لئے کیا اقدامات کئے جانے چاہئیں؟

سلام بن رزاق: — ایک زمانہ تھا جب اردو مشترکہ کلچر کی زبان تھی اور انگریزی کے بعد ملک میں اردو ہی کا بول بالا تھا مگر تقسیم کے بعد سے بھارت میں اردو کی حالت ایک پناہ گزیں کی سی ہو گئی ہے۔ فی زمانہ چند پرانے غیر مسلم لکھنے پڑھنے والوں سے قطع نظر اردو صرف مسلمانوں بلکہ غریب مسلمانوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو والے اردو کی زبوں حالی کا رونا تو روتے ہیں مگر اس کی بقا اور فروغ کے لئے ہم نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا اور نہ ہی اس کی ترقی و ترویج کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار کیا۔ اب تو اس کے لئے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔ زبان صرف سرکاری امداد اور حکومت کی

سرپرستی سے زندہ نہیں رہ سکتی اسے دل میں جگہ دینی ہوتی ہے۔ اپنے روزمرہ کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ یہودیوں نے صدیوں تک خانہ بدوش کی زندگی گزاری مگر "ہبیرو" زبان کو اپنے سینے سے لگا کے رکھا۔ ہمیں بھی اردو کے ساتھ اسی محبت کا ثبوت دینا ہوگا ورنہ اس ملک میں اردو زبان بھی رفتہ رفتہ فارسی کی طرح کالعدم ہو جائے گی۔

"فروغ" کی بات تو بعد میں آئے گی، پہلے تو اس کی بقا کے جتن کرنے ہوں گے۔!!!

❊❊❊

(شمس الرحمٰن فاروقی کے نام)

نیند کے خلاف ایک بیانیہ

خالد جاوید

وہ جو ایک کتے کی طرح گم ہو جائے گا
آخر میں ایک دیوتا کی طرح دریافت کیا جائے گا
(یہودا امی خائی)

[ا]
ڈاک گھر اور ڈاکیے

ادھر کچھ عرصے سے لگاتار چند قصے گو حضرات کے ساتھ رات کو دیر تک وقت گزارنے کی وجہ سے میرے اندر یہ بھی خبط پیدا ہونے لگا ہے کہ میں کچھ لکھوں، یہ خبط یا شوق مجھے زندگی میں پہلی بار ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی بھی نہ ہوتا اگر چند ماہ پیشتر میری بیوی طاعون کا شکار ہو کر مر نہ گئی ہوتی۔ حالانکہ جب اسے پلیگ ہوا تو وبا تقریباً اپنے خاتمے پر ہی تھی کیونکہ سرکاری شفا خانے میں اس دن سیاہ دیوار پر چاک سے آخری کراس بنایا گیا تھا۔ سرکاری شفا خانے کی عقبی دیواریں کالے رنگ کی ہیں۔ اس دن، سوائے ایک لڑکھڑاتے ہوئے مریل سے چوہے کے، جس کے منہ کے خون کی لکیر پھوٹ رہی تھی، دوسرا کوئی چوہا بھی علاقہ میں نظر نہیں آیا۔ مگر کسی بھی وبا میں پہلی یا آخری موت بہر حال انفرادی اور امتیازی نوعیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔

مغرب کی اذان کے وقت جب وہ مر رہی تھی تو اس کا بخار سے تپتا ہوا جسم حیرت انگیز طور پر پسینے چھوڑتے ٹھنڈا ہونے لگا۔ میرے دونوں بچے (بڑا تیرہ سال کا ہے اور چھوٹا بارہ کا) پلنگ کی پائنتی بیٹھے اس کے پاؤں سہلا رہے تھے کہ اچانک اس کے منہ اور ناک سے ڈھیر سارا خون باہر آیا۔ میں نے بیوی کے سرہانے سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کی بغلوں میں دیتے

ہوئے اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا سارا جسم شل اور بے جان ہو گیا تھا۔ وہ تو نہ اٹھ سکی مگر میری دونوں ہتھیلیاں اس کی بغلوں میں ابھر آئیں طاعون کی بڑی بڑی گانٹھوں سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ گانٹھوں سے رسنے والے پس سے میری انگلیاں گیلی ہو گئیں۔

میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے بیحد کراہیت اور گھن محسوس ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس وقت اس کے منہ اور ناک سے نکلتے ہوئے خون اور بغلوں اور جانگھوں کے درمیان گانٹھوں سے رستے بدبودار مواد کی وجہ سے مجھے اس نیک بخت کی موت کا صدمہ محسوس ہی نہ ہو سکا۔ میں نے بھی سوچا کہ یہ بس آخری بار ہے۔ یعنی یہ گندگی یہ تعفن اور شب بیداریوں کے سبب جاگتی جلتی آنکھیں جو کہ ایک تیماردار کا لازمی مقدر ہوتے ہیں۔

مگر میں یہاں اپنی بیوی کے بارے میں یا اس کی بیماری اور موت کے بارے میں یونہی لکھ بیٹھا ہوں۔ شاید اناڑی پن اور ناتجربہ کار ہونے کے سبب۔ میری سات پشتوں میں بھی کسی نے اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں یا اپنے احساسات و جذبات کے بارے میں کچھ نہ لکھا ہوگا۔ میں نہ تو کوئی ادیب ہوں اور نہ کوئی کاتب یا منشی۔ میں تو ایک معمولی ڈاکیہ ہوں۔ جی ہاں ایک بیحد معمولی اور حقیر ڈاکیہ جس کی انگلیوں کو اس طرح سے قلم پکڑنے کی عادت ہی نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اگر وہ یعنی گھر والی مر نہ گئی ہوتی تو شاید اس وقت گہری نیند سو رہا ہوتا۔ مگر ٹھہرئیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ میں نے اس کی موت سے متاثر ہو کر کچھ لکھنا شروع کر دیا ہے جس طرح میں نے سنا ہے کہ شاعر لوگ کرتے رہتے ہیں۔ میں جو لکھ رہا ہوں اس کی نوعیت ادبی یا علمی قسم کی نہیں ہے۔

ہوا دراصل یوں ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد، میرے لئے رات کاٹنا مشکل پڑ گئی ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے میں نے اپنی ایک بیوہ بہن کو گاؤں سے بلوا لیا ہے۔ میں صبح آٹھ بجے اپنی وردی پہن کر ڈیوٹی کے لئے سائیکل پر گھر سے نکلتا ہوں۔ ڈاک خانے پہنچ کر اپنے حصے کی ڈاک وصول کرتا ہوں پھر اسی ڈاک کو جس میں سینکڑوں چٹھیاں، منی آرڈر، پارسل وغیرہ ہوتے ہیں، سائیکل کے کیریئر پر لاد کر اپنے علاقہ میں بانٹنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ آج کل میرے پاس داؤد کا کنواں نام کا محلہ ہے۔ شام کو جب تھکا ہارا گھر واپس آتا ہوں تو سب سے پہلے اپنی وردی اتار کر دیوار پر لگی کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہوں۔ میرا چھوٹا بیٹا وردی کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہتا ہے۔ خیر اس تفصیل میں جانے سے کیا فائدہ۔ بہر حال جب رات کو کھانے کے بعد گھر سے نکلتا ہوں تو محلے کے کچھ شناسا لوگ مجھے اپنے ساتھ چبوترے پر

بیٹھا لیتے ہیں۔ ہیں تو یہ بالکل ان پڑھ لوگ، مگر بلا کے قصہ گو، یا پھر یوں کہیں کہ اول نمبر کے گپی لوگ۔ آج کل گرمیاں ہیں۔ رات کو یہ سب طرح طرح کے قصے سناتے رہتے ہیں۔ بھوت، پریتوں کے قصے، سینما کے قصے، شکار کے اور فاحشہ عورتوں کے قصے، میرا وقت واقعی اچھا کٹ جاتا ہے۔ اب ان کے یہ اوٹ پٹانگ قصے سن سن کر میرے دل میں بھی یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوئی ہے کہ میں بھی کچھ سناؤں یا کہوں۔ لیکن میں بڑا جھینپو اور دبو قسم کا انسان واقع ہوا ہوں اس لئے میں نے یہ سوچا ہے کہ بجائے کہنے کے کیوں نہ میں کچھ لکھنا شروع کردوں۔ کہنے اور لکھنے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ لکھتے وقت آدمی بہت زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتا جبکہ قصہ گوئی، بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر قسم کی گفتگو زیادہ تر جھوٹ کا پلندہ ہی ہوتی ہے، میرا کام تو ویسے بھی لکھے گئے الفاظ کو ہی ادھر سے ادھر کرنا ہے۔ آخر کو میں ایک ڈاکیہ ہوں نا۔

اس لئے اب میں نے سوچا ہے کہ اپنے بارے میں، اپنی زندگی کے بارے میں، کیوں نہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ حالانکہ مجھے یہ بھی علم ہے کہ اپنے بارے میں یا اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بھی لکھنا، میرے لئے شاید ڈاک گھر اور ڈاکیوں کے بارے میں لکھنے کے ہی برابر ہوگا۔ ویسے ایمان کی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو جہاں تک ہوسکے، ذاتی یا نجی باتوں کے بارے میں کم سے لکھنا چاہئے۔ یہ باتیں ہوتی ہی کیا ہیں سوائے نفرت یا محبت یا پھر غصے اور انتقام وغیرہ کے بارے میں —— ناپختہ تجربوں کے سوائے ان میں کیا ہوتا ہے۔ ذاتی یا نجی باتیں بدلتی رہتی ہیں۔ وہ تقریباً اسی قصہ گوئی کی طرح ہوتی ہیں جو ہر بار سنانے میں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ اضافہ، تبدیلی یا ترمیم کر لیتی ہیں۔ نجی واقعات چاہے وہ کتنے ہی ٹھوس انداز میں کیوں نہ پیش آئے ہوں، ایک نہ ایک دن سفید جھوٹ ہی ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا میرا خیال ہے کہ لکھنے کے لئے اور بہت سی باتیں ہیں۔ مثلاً ڈاکیوں کی، ڈاک گھروں کی، ریلوے اسٹیشنوں کی، گلیوں کی محلوں کی وغیرہ وغیرہ۔

تو جب میں اپنی سائیکل پر دن بھر کی ڈاک لاد کر سڑکیں ناپنے چلتا ہوں تو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ پتلی سے پتلی گلیاں، یہاں تک کہ بند گلیاں تک مجھے آسمان پر جانے والی سیڑھیاں محسوس ہوتی ہیں جن پر گویا میں تیزی سے چڑھتا جاتا ہوں۔ ابھی حال میں ریڈیو پر خبر سنی تھی کہ آدمی چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے لگتا ہے کہ چاند پر پہنچنے کے لئے اس نے جو سفر طے کیا ہوگا، وہ میرے اس روز کے چھٹی پہنچانے تک کے سفر کے برابر ہی مسرت آگیں رہا ہوگا۔ یہاں میرے اسی چھوٹے سے شہر کے آس پاس ندیاں بہت ہیں۔

کبھی کبھی مجھے ان کے کنارے، دلدل پر بھی چلنا ہوتا ہے۔ وہاں میری سائیکل کے پہیے بھی کبھی کبھی دھنس جاتے ہیں مگر مجھے وہ دلدل ایسی دنیا کی نہیں بلکہ بہشت کی دلدل نظر آتی ہے۔

مگر مجھے علم ہے کہ سب ہی ڈاکیے اس طرح سے نہیں سوچتے۔ بہت سے تو اپنی نوکری کو کوستے بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں اتنا تو ہے کہ ڈاکیوں کی نوکری میں خطرے بھی بہت رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگ بتاتے ہیں کہ ہر ڈاکیے کے ساتھ میں ایک ڈھول بجانے والا بھی رہتا تھا جو جنگل کے خطرناک راستوں سے گزرتے وقت زور زور سے ڈھول بجاتا رہتا تھا کہ جنگلی جانور وہاں سے بھاگ جائیں، بہت رات ہو جانے پر ڈاکیے کے ساتھ دو مشعلچی اور دو تیر انداز بھی چلا کرتے تھے۔ میں نے کل اپنے چھوٹے لڑکے کو بتایا کہ ایک بار تو ایسا ہوا کہ ایک ڈاکیے کو شیر اٹھا کر لے گیا۔ ایک ڈاکیہ بے چارہ ندی کی باڑھ کی چپیٹ میں آ کر ڈوب گیا تھا.......... اور بھی کتنے ہی قصے ہیں۔ نہ جانے کتنے ڈاکیوں کو زہریلے سانپوں نے ڈس لیا ہے۔ بہت سے کسی چٹان کے پھسلنے یا ملبے میں دب کر مر گئے۔ لٹیروں اور ٹھگوں نے بھی بہت سے ڈاکیوں کو راستے میں لوٹ کر قتل کیا ہے۔ مگر یہ سب پرانی باتیں ہیں، بہت پرانی، اب کسی ڈاکیے کو اس طرح کے خطرات کا سامنا نہیں ہے۔

کچھ دنوں سے اپنے چھوٹے لڑکے میں ایک عجیب بات میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اسے ڈاکیوں کی باتوں اور ڈاک خانوں کے تذکروں میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ میں اس کی طرف سے تھوڑا سا فکر مند بھی ہوں۔ اب میں کیسے لکھوں...... بات تو ہے بیحد ذاتی نوعیت کی مگر لکھ دینے میں بھی کیا حرج ہے۔ اب آدمی اس طرح کی باتیں لکھنے سے بالکل ہی تو بچ نہیں سکتا ہے۔

اصل میں، میرا یہ چھوٹا ان دنوں پیدا ہوا تھا جب شہر میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی ہی تھی کہ ان دنوں ہمارا گھر وبا سے پوری طرح محفوظ رہا...... اب سوچا جائے تو یہ بھی بڑی عجیب بلکہ مضحکہ خیز سی بات ہے کہ طاعون کی زد میں آ کر ہی میری بیوی، یعنی اس کی ماں خدا کو پیاری ہوئی اور طاعون کے زمانے میں ہی یہ کم بخت پیدا ہوا تھا۔ بہر نوع، یہ سب تو مشیت ہے، اللہ کی جو مرضی، ادھر کے اطراف میں تو طاعون پھیلتا ہی رہتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے کا سر کچھ کچھ چوہے سے ملتا جلتا ہے۔ خیر وہ بھی ایسی کوئی بات نہیں بہت سے لوگوں کے سر کی بناوٹ کسی جانور کے سر سے مشابہ ہوتی ہے۔ کسی کا سر گھوڑے سے ملتا جلتا ہے تو کسی کا بلڈاگ کتے کے سر سے، مگر بات یہ ہے کہ وہ مجھے دماغی طور پر کچھ کمزور محسوس ہوتا ہے۔ خدا

کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔ ویسے وہ اسکول پابندی سے جاتا ہے۔ (بڑے لڑکے کو تو سوائے محلے کے لونڈوں کے ساتھ اودھم مچانے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے)

مگر چھوٹا...... وہ آخر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیلتا کیوں نہیں؟ بس ڈاکیوں اور ڈاک گھروں کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میری جان کیوں کھاتا رہتا ہے اور جب میں اسے جو کچھ بھی جانتا ہوں، وہ بتاتا ہوں تو بجائے بچوں کی طرح خوش ہونے کے، کچھ سنجیدہ سا ہو جاتا ہے یا پھر کہیں دور خلا میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ میں نے اسے ڈاکیوں کے بارے میں بہت سے دلچسپ قصے بھی سنائے ہیں۔ اصل میں یہ من گڑھت قصے ہی ہوں گے کیونکہ انہیں میں بھی اپنے بچپن سے سنتا چلا آیا ہوں۔

مثال کے طور پر جاڑوں کی سرد اور ویران راتوں میں ایک ڈاکیے کا بھوت سنسان گلیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ رات کے ٹھیک دو بجے کسی کا دروازہ کھٹکتا ہے۔ "تار۔ تار" جو کوئی بھی اٹھ کر تار لینے کے لئے دروازہ کھولتا ہے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ویران سے ریلوے اسٹیشن پر سال میں ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب رات کے دو بجے وہاں پہنچنے والی طوفان میل سے ڈاک کا ڈبہ آپ ہی آپ کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ ٹرین ایک منٹ وہاں رکنے کے بعد روانہ ہو جاتی ہے۔ مگر ڈاک کا وہ کٹا ہوا لال رنگ کا ڈبہ، آپ ہی آپ، بغیر انجن کے اندھیری رات میں خاموش جھاڑیوں سے گھری ویران ریلوے کی پٹریوں پر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ میرا تو اس اسٹیشن پر جانے کا کبھی اتفاق ہوا نہیں مگر بتانے والے بتاتے ہیں کہ غدر کے زمانے میں بہت سے سرکاری محکموں کے ساتھ ڈاک گھر بھی نشانہ بنے تھے، تب ایک رات جب ڈاک گھر میں آگ لگائی جا رہی تھی، اپنی جان پر کھیل کر کچھ فرنگی ڈاکیے وہاں کی ڈاک کو طوفان میل سے منسلک ڈاک کے ڈبے میں کسی نہ کسی طرح رکھ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر آخری وقت میں انقلابیوں نے ڈاک کے اس لال ڈبے کو ٹرین سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا اور اسی میں آگ لگا دی تھی، بالکل اسی طرح جس طرح انہوں نے وہاں تک ڈاک لانے والے فرنگی ڈاکیوں کے سر دھڑ سے کاٹ کر الگ کر دئے تھے پھر ان کی لاشوں کو آگ لگا دی تھی۔

کہتے ہیں کہ تب سے لے کے اب تک ہر سال اسی تاریخ کو رات کے دو بجے، سر کٹے ہوئے اور جلی ہوئی وردی پہنے چند ڈاکیے اسی اندھیرے اسٹیشن پر لالٹین ہاتھ میں لئے گھومتے نظر آتے ہیں اور طوفان میل سے ڈاک کا ڈبہ کٹ کر ریل لائینوں پر اکیلا ہی دوڑتا پھرتا ہے۔

ایک حواس باختہ بھوت کی طرح۔

میں اسی قسم کے ڈراؤنے اور دلچسپ قصے جب اسے سناتا ہوں تو وہ جواب میں کچھ نہیں کہتا، نہ ہی ڈرا سا محسوس ہوتا ہے۔ ہاں اس دن ضرور وہ کچھ خوف زدہ سا محسوس ہوا تھا جب کالی ندی کے پل پر سے مغرب کے وقت اس نے ان لوگوں کو دیکھا جو اپنے پیروں پر بانس باندھے ہوئے قطار بنا کر گزر رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ ان سے ڈرنے کے کیا معنی یہ تو سگریٹ کے کسی خاص برانڈ کے اشتہار کی خاطر مسخرہ پن کرنے کے لئے نکلے ہیں۔

ادھر آ کر چھوٹے کو دین اور اللہ رسول کی باتوں میں بہت دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے، قرآن شریف تو خیر اسی کی بوا نے پہلے ہی اس کو پڑھا دیا تھا مگر فرشتے جس طرح اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی پورا کرتے ہیں، تو اس پورے الہوہی نظام سے وہ بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر جبرئیل علیہ السلام سے۔

جہاں تک بڑے لڑکے کا سوال ہے تو اسے نہ تو اسکول کی تعلیم سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی دینی تعلیم سے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔

تقریباً بیس دن سے اس کاغذ پر میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا دل ہی نہیں چاہا۔ دراصل ہوا یوں کہ چھوٹے کی گردن پتنگ کے مانجھے میں پھنس گئی تھی۔ نرخرہ کٹتے کٹتے بچا۔ خدا نے بڑی خیر کی اس بے چارے کو پتنگ وغیرہ سے کوئی کیا کام مگر اب ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ وہ میرے گھر کے سامنے، کچھ دور نکل کر کالی ندی کا جو پل ہے اسی کی ریلنگ پر دونوں طرف مانجھا بنانے والے مانجھا تانتے ہیں۔ بس وہ گزر رہا ہوگا پل پر سے۔ اسے ندیاں دیکھنے کا شوق بھی بہت ہے۔ (حالانکہ ندیوں اور کنوؤں کے آس پاس گھومنا خطرناک بات ہے)

وہیں اس کی گردن تنے ہوئے مانجھے میں پھنس گئی۔ میں تو ڈاک بانٹنے گیا ہوا تھا۔ میری بہن اور محلے کے کچھ لوگ اسے لے کر سامنے والے گھر میں لے گئے جہاں حال ہی میں ایک سرکاری ڈاکٹر کہیں سے تبادلہ ہو کر رہنے لگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے ٹانکے لگانے اور مرہم پٹی کرنے کی کوئی فیس بھی نہیں لی۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی بہت اچھی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے چھوٹے کو پڑھنے کے لئے انگریزی کی ایک کتاب بھی دی ہے۔ کتاب پر ان کی بیٹی کا نام لکھا ہوا ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھتی ہے، چھوٹے سے دو سال بڑی ہوگی۔ بڑا گول چہرہ ہے اس کا اور بالکل سفید، اتنا گول اور سفید چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔

مگر چھوٹے کا زخم بھرنے میں بیس دن لگ گئے۔ ٹانکوں میں بار بار پس پڑ جاتا تھا۔ ہلکا

ہلکا بخار بھی رہنے لگا ہے۔ اس درمیان ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹی کو کئی بار ہمارے گھر، چھوٹے کی خیریت لینے کے لئے بھیجا۔ کتنی بڑی بات ہے۔ ایک معمولی ڈاکیے کے بچے کا اتنا خیال، یقیناً ان کے دل میں خوف خدا ہوگا۔ دنیا ایسے ہی نیک لوگوں پر قائم ہے۔

تو بس میں انہیں ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہا، لکھنے کو دل ہی نہ چاہا۔ ویسے بھی میں کوئی ڈائری تو لکھ نہیں رہا ہوں، یہ تو بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں کے کام ہیں۔ میں تو بس ایک جعلی قسم کی قصہ گوئی کر رہا ہوں جس کا چسکا مجھے ان غپ مارنے والوں نے لگا دیا ہے۔ جعلی میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر قصہ زبانی نہ سنایا جائے تو وہ قصہ ہی کیا اور جسے لکھا جائے تو وہ تو صرف دل کی ایک بھڑاس ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا میرے اندر بھی ایسی ہی کوئی بھڑاس ہے تو بہت غلط ہے۔ کچھ کچھ ایسے جیسے کیلے کے چھلکوں کو گھر سے باہر سڑک پر پھینک دینا۔ دوسروں کو پھسلتے رہنے کے سامان فراہم کرنے کے برابر۔

چھوٹے کے پاس وہ جو انگریزی کی کتاب ہے، اس میں بہت سے موضوعات پر مضامین لکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں اور ساتھ میں نمونے کے طور پر کچھ مضامین بھی شامل کر دئے گئے ہیں مثلاً تاج محل پر، گائے پر اور پوسٹ مین پر۔

اب تو پاگل کو رٹ ہی لگ گئی ہے کہ وہ پوسٹ مین پر ایک ایسا طویل اور زبردست مضمون لکھے گا جو دنیا میں آج تک کسی نے نہ لکھا ہو۔ اب میں اسے لاکھ سمجھاتا ہوں کہ تمہاری جماعت کے بچوں کو زیادہ سے زیادہ دوسو الفاظ کا مضمون لکھنا ہوتا ہے ورنہ نمبر کاٹ لئے جاتے ہیں مگر وہ مانے تب نا۔ اس نے تو ضد پکڑ لی ہے۔ ڈاکیوں کے بارے میں ایک سے ایک معلومات اس نے نہ جانے کہاں سے حاصل کر لی ہیں۔ شاید وہ یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی بیٹی کو بھی دکھائے گا۔ کل رات میں نے اس کا پوسٹ مین پر لکھے مضمون کو پڑھا ہے جو ابھی ادھورا ہے۔ مضمون ابھی میرے سامنے ہی ہے کیوں نہ اس کا ایک آدھ اقتباس میں یہاں نقل کر دوں:

"خطوں کے ساتھ اگر ڈاکیے کی یاد نہ آئے تو وہ خط ہی کیا۔ ڈاکیے کی پہنچ جس طرح دنیا کے عام سے عام آدمی تک ہے ایسی کسی اور سرکاری نوکری کی کہاں۔ لوگ چاہے وہ شہروں میں رہتے ہوں یا قصبوں میں، یا پھر گاؤں اور دور دراز کے جنگل کے علاقوں میں، وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے، ایک فرشتے کی طرح جس کے پاس عام آدمی کی پیاری سواری یعنی سائیکل ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ پیدل بھی چلتا تھا کبھی گھوڑوں پر بھی قاصد بجلی کی رفتار سے دوڑتے تھے اور اپنے اپنے علاقہ کی سرحد تک پہنچ کر وہ دوسرے گھڑ سوار قاصد کو خط سونپ دیا کرتے تھے۔ دنیا

میں امن کے کتنے مجاہدے ان قاصدوں کی رفتار کے مرہون منت رہے ہیں۔ کچھ مقاموں پر کبوتروں نے بھی ڈاکیے کا کام انجام دیا ہے۔ اس لئے کبوتر کو فرشتہ نما اور پاکیزہ جانور مانا جاتا ہے۔ ڈاکیے کا سماج کے ہر طبقے میں استقبال ہے۔ تیوہاروں کے موقع پر ہمیشہ ہی اسے کچھ نہ کچھ بخشش دی جاتی ہے۔ ڈاکیہ سرکار کا پرزہ نہیں بلکہ سماج کا ایک حصہ ہے وہ جب کسی کے گھر تار لے کر جاتا تھا تو تھوڑی دیر وہیں ٹھہر جاتا تھا، انسان کے سکھ یا دکھ میں ایمانداری کے ساتھ شریک ہونے کے لئے۔ آج بھی بہت سے ڈاکیے اجنبی انسانوں کے سکھ دکھ میں اسی طرح شریک ہیں۔ میرے بابو بھی ایک ایسے ہی ڈاکیے ہیں۔ ایک عظیم ڈاکیے۔

بہت کم لوگوں نے غور کیا ہوگا کہ اس کی وردی کا رنگ پولس والوں کی وردی سے ملتا جلتا ہے۔ مگر پولس والوں کی وردی نے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے سوا اب تک کیا کیا ہے؟ جب کہ ڈاکیے کی وردی دیکھ کر لوگوں کے دل اپنائیت اور انسیت کی خوشبو سے بھر جاتے ہیں۔ گرمی کی سخت اور سنسان دوپہر میں، جب آسمان میں چیل انڈا چھوڑ رہی ہوتی ہے، اس کی خاکی وردی کی ایک جھلک دور سے نظر آنے پر ہی وہ ویران دوپہر رونق افزا ہو جاتی ہے اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں امیدوں کے گلزار سجنے لگتے ہیں۔

کسی کو خط لکھنا اور کسی سے خط پانا بہت بڑی نعمت ہے، میرے بابو یہی کہتے ہیں۔ میں نے پڑھا ہے کہ گاندھی جی خطوں کا جواب فوراً ہی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کے پاس روزانہ ڈھیر سارے خطوط آتے تھے، خط کا جواب لکھتے لکھتے جب ان کا دایاں ہاتھ تھک جاتا تھا تب وہ بائیں ہاتھ سے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ کتنے اچھے تھے گاندھی جی! اتنے نیک اور عظیم انسان کو بھی کسی نے قتل کر دیا۔ آخر کیوں؟

خطوں کے حوالے سے پوسٹ کارڈ کی بات کرنا بھی ضروری ہے۔ سرکار ہر شئے کو مہنگا کر سکتی ہے مگر پوسٹ کارڈ کے دام بڑھاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ ایک وہی تو عوام کی سب سے پیاری چیز ہے۔ روٹی اور دودھ اور دال اور چاول سے بھی پیاری چیز جو حقیر سے حقیر انسان کے وجود کو بھی بامعنی اور باوقار بنا دیتی ہے۔ ابھی حال میں اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ امریکہ میں ایک الیکٹرانک میوزک بینڈ کی ایجاد ہوئی ہے جس کا نام پوسٹل سروس رکھا گیا ہے۔ یہ نام اسلئے ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے جانے کن کن ملکوں سے آپس میں پوسٹ کارڈ لکھ لکھ کر آلات موسیقی کے بارے میں اپنے اپنے تجربات بیان کئے جن کو جمع کر کے یہ عظیم الشان بینڈ بنایا گیا۔

ڈاکیے کا نہ کوئی مذہب ہے نہ ذات اور نہ ہی کوئی طبقہ بلکہ وہ تو سماج کی مختلف اکائیوں اور طبقوں کو آپس میں ملانے اور پرونے کا کام انجام دیتا ہے۔

ہماری فلموں میں بھی اکثر ڈاکیے کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی بھی فلم نہیں دیکھی ہے مگر بابو نے وعدہ کیا ہے کہ جب بھی ان کی جوانی کے دنوں کی مشہور فلم ''ڈاک ہرکارہ'' دوبارہ کبھی نمائش کے لئے پیش کی جائے گی تو وہ مجھے دکھانے کے لئے ضرور لے جائیں گے۔ لیکن میرا ماننا ہے کہ ڈاکیہ فلموں کا نہیں بلکہ اصل زندگی کا ہیرو ہے۔ میرے بابو کی طرح۔ جب وہ اپنی خاکی رنگ کی وردی پہن کر، ٹوپی لگا کر ڈاک گھر جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو اس طرح جگمگانے لگتے ہیں جس طرح مٹی میں ہیرا۔

اور اب آخر میں یہ بتانا بھی چاہتا ہوں کہ شروعات کے دنوں میں صرف خط یا چٹھی تقسیم کرنا ہی ڈاک والوں کا کام نہ تھا بلکہ وہ سرایوں کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ وہ سڑک پر دن رات چلنے والے مسافروں کے سفر کو آسان اور سہولت سے بھرا ہوا بنا دیتے تھے۔ انہیں ٹھگوں اور راہزنوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ یہی سرائے بعد میں آگے چل کر ڈاک بنگلوں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ رات کو مسافر راستے میں پڑنے والی ڈاک چوکیوں میں بھی آرام کر سکتے تھے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ کہ کچھ عرصے تک گاؤں اور دور دراز کے علاقوں میں ڈاکیوں نے پلیگ کی دوائیاں مریضوں تک پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیا۔''

اب بھلا بتائیے کیا یہ بارہ تیرہ سال کے بچے کی تحریر معلوم ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مضمون میں بڑی بے ربطی ہے۔ جگہ جگہ کچا پن بھی ہے مگر وہ تو فطری ہی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس نے اتنی ساری معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں اور بھلا ان تمام معلومات کا فائدہ؟ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب اسی کے ذہن کا تخیل ہو۔ اس میں سے کسی بھی بات میں کوئی صداقت نہ ہو مگر اگر ایسا ہے تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں۔ آخر اس کے ننھے سے ذہن پر ڈاکیے اور ڈاک گھر اتنا حاوی کیوں ہیں؟ کیا اس کی وجہ میں ہوں۔ لیکن اب اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ میں ایک...... حقیر سا ڈاکیہ۔ یہ بھی کوئی رتبہ ہوا......؟ اگر میں ڈاکٹر یا وکیل یا کوئی نیتا وغیرہ ہوتا تو بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ ان لوگوں کے بچے اپنے ماں باپ کی نقل اتارا ہی کرتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر، بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ میں خواب میں بھی ہرگز نہ چاہوں گا کہ میری اولاد بھی ڈاکیہ بنے۔ بھلے ہی مجھے اپنی چٹھیاں بانٹنے کیلئے نکلنا کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگتا ہو۔ امتحان میں ڈاکیے پر ہزار پانچ سو لفظوں میں مضمون لکھ دینا الگ بات ہے اور ڈاکیہ بننا ایک

قطعاً مختلف اور دوسری بات۔ دنیا ایسی ہی منافقتوں کی وجہ سے تو اتنی خوبصورت نظر آتی ہے۔

کچھ عرصے سے میں یہ واضح طور پر محسوس کرنے لگا ہوں کہ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے۔ اس میں سے شرافت غائب ہوتی جارہی ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا انسان ہوں مگر یہ پیشین گوئی کرسکتا ہوں کہ آگے آنے والا زمانہ بہت ہی خراب ہوگا۔ میرا بڑا لڑکا بھی غلط صحبتوں میں پڑتا نظر آرہا ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے میں تو کیا، قاعدے کے کھیل کود میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری ڈانٹ پھٹکار کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے، وہ اتنا بے غیرت ہو چکا ہے کہ میں نے اسے اب زیادہ کچھ کہنا سننا چھوڑ دیا ہے۔ محلے میں غنڈہ گردی بڑھتی جارہی ہے، گلیوں میں لفنگوں اور شہدوں کے جتھے ٹہلتے رہتے نظر آتے ہیں۔ بیروزگاری بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس ماحول کی وجہ سے ہی شاید سامنے والے ڈاکٹر صاحب یہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور جا بسے ہیں، یا شاید ان کا کہیں تبادلہ ہوگیا ہے۔ وہ لوگ اتنی خاموشی سے مکان خالی کر گئے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ اچھا ہی ہوا۔ ویسے بھی یہ بڑا منحوس علاقہ ہے۔ جب دیکھو تب یہاں طاعون ہی پھیلتا رہتا ہے۔ مگران کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ چھوٹا کچھ گم سم سا رہنے لگا ہے۔

کل یہاں ایک بہت ہی تکلیف دہ اور شرمناک واقعہ ہوا۔ کالی ندی کے پل کو پار کرتے ہی بائیں طرف سڑک کنارے ایک چھوٹی سی ہری مسجد ہے۔ وہاں کوئی پردیسی آ کر ظہر کی نماز پڑھنے لگا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ دوسرے مسلک کا ہے بس پھر کیا تھا، نمازیوں نے اپنی نیت توڑ کر اس پر حملہ کر دیا جیسے وہ کوئی موذی سانپ تھا یا اس سے بھی بدتر۔ انہوں نے مسجد سے اسے دھکے دے دے کر باہر نکال دیا۔ محلے کے کچھ نوجوان غنڈے اس کی طرف چاقو نکال کر بھی دوڑے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اسے لگا نہیں۔ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگا۔ اس کے بعد مسجد کا فرش، دیواریں اور یہاں تک کہ مینار بھی دھو کر پاک کیے گئے۔ امام صاحب کا کہنا تھا کہ غیر مسلک کے آدمی کا نماز ادا کرنے سے اللہ کا گھر ناپاک ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں، میں دین و مذہب کی اتنی باریک باتیں نہیں جانتا۔ مگر میں ایک بات سے اور فکر مند ہوں اور وہ یہ کہ مجھے شبہ ہے کہ بڑا بھی ان لونڈوں میں شامل تھا جو اس بے چارے کے اوپر چاقو تانتے ہوئے دوڑے تھے۔ اس واقعہ سے آج کل ماحول میں تناؤ سا ہے۔ کل کوئی کہہ رہا تھا کہ آس پاس کے لڑکے زیادہ تر اپنے پاس چاقو اور دیسی طمنچہ رکھنے لگے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی حفاظت کرنا سمجھداری کی بات ہے کیونکہ پورب کی سمت سے، جہاں نچلے طبقہ کے ہندوؤں کی بستی ہے، کبھی بھی مسلمانوں پر دھاوا بولا جا سکتا ہے۔

مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ آج کل ڈاک بانٹنے کے کام میں میری طبیعت لگتی نہیں، مسجد والے واقعہ کے بعد سے میرا دل برا ہو گیا ہے، میں تو سوچتا ہوں کہ یہ جو اتنے سارے خط، پیغامات وغیرہ میں ایک انسان سے دوسرے انسان تک پہنچا تا رہتا ہوں، آخر ان میں ہوتا کیا ہے۔ یہ محبت نامے ہیں یا طاعون کے جراثیم؟ کیا انسان دوسرے سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے یا پھر یہ کہ کیا سارے لوگ ایک بھیانک نیند کے شکار تو نہیں ہو گئے ہیں؟ کسی ہدایت، کسی تلقین، کسی پیغام، محبت اور خوشی کی ان تک واقعتاً کوئی رسائی ہی نہیں ہے۔ وہ ایسی سیاہ نیند میں حرف نفرت اور تشدد کے خواب دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسی نیند کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ یہ کام صور اسرافیل کے علاوہ اور کسی کے بس میں نہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب مجھے لکھنے کا یہ شوق چرایا تھا۔ میں نے چاہا تھا کہ ذاتی باتیں نہ لکھوں مگر اب جو اپنا لکھا ہوا پڑھتا ہوں تو یہ سب مجھے اپنی نجی ڈائری کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر کل کلاں کو کسی کو میرا یہ پلندہ مل جائے تو اس بکواس کو وہ ایک ڈاکیے کی ڈائری ہی سمجھے گا، کوئی قصہ، کہانی تو ہرگز نہیں۔ لہٰذا اب جا کر اس افسوسناک امر کا احساس مجھے ہوا ہے کہ جسطرح کسی جانور کی کھال اتارتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ اس سے لگا لپٹا خون نہ باہر آئے۔ بالکل اس طرح دنیا کے بارے میں کوئی بھی بات لکھتے وقت انسان کی ذات کے لہو کی بو لفظوں سے ہمیشہ لپٹی رہتی ہے۔

اس لئے مایوس ہو کر میں یہ بیکار کا مشغلہ اب ترک کر رہا ہوں۔ بس اتنے ہی میں میرا شوق پورا ہو گیا یا یہ کہئے کہ اب میرا دل بھر گیا۔ میں اس کے آگے کچھ بھی لکھنے سے بھر پایا۔

اس کے بجائے، میں نے سوچا ہے کہ مجھے اپنی توجہ اپنی بوسیدہ سائیکل کو دینا چاہئے جس کی مرمت ایک عرصے سے ٹل رہی ہے۔ اس کے دونوں پہیوں میں لہر آ گئی ہے اور مڈ گارڈ کھڑ کھڑ بولتا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے چھوٹے کے ساتھ اب زیادہ وقت گزارنا چاہئے۔ آج کل رات کو سوتے وقت وہ بڑے بھاری بھاری خراٹے لینے لگا ہے اور اس کا سر تو اب بالکل ایک طاعون زدہ چوہے کا ہی ہوتا جا رہا ہے۔

[۲]

خون سے خالی سفید گول چہرہ

'تم پھر آ گئے' بڑے بھائی نے لئی بناتے بناتے اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ جواب میں کچھ نہ بولا۔ بس سامنے پڑی لکڑی کی کالی اور گندمی میز پر ٹین کے ایک

بدرنگ ڈبے میں رکھی سفید گاڑھی لئی کواور کالی کالی مہروں کو چمکتی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس لئی سے لفافے بند کئے جائیں گے۔ ڈاک ٹکٹ چپکائے جائیں گے اور پھر یہ کالی مہریں ان پر ثبت کردی جائیں گی۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈاک گھر تھا۔ انگریزوں کے زمانے کی گوتھک طرز ایک گول اور منحوس پرانی عمارت۔ عام طور سے یہ گول ڈاک خانہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا بھائی اسی گول ڈاک خانے میں لئی اور گوند بنانے کا کام کرتا تھا۔

"تم بھاگ جاؤ یہاں سے، میرا مذاق نہ بنوایا کرو۔" بڑے بھائی نے لئی سے سنی انگلیاں ایک کپڑے سے صاف کیں۔

"میں وہ سرنگیں دیکھنے آیا ہوں" وہ سر جھکائے ہوئے آہستہ سے بولا۔

"کون سی سرنگیں؟"

"بابو نے بتایا تھا کہ اس ڈاک خانے کے نیچے کچھ سرنگیں ہیں جو بہت دور دور کے شہروں کے ڈاک خانوں میں جا کر کھلتی ہیں۔"

ہاں سنا میں نے بھی ہے مگر ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ فوجی تحویل میں ہیں اور ان میں اسلحہ بھرا ہوا ہے۔"

وہ مایوس ہو گیا۔

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں" اس نے اپنی وردی کی شکنیں درست کیں۔ سر پر ٹکی ٹوپی کو سیدھا کیا اور اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے تقریباً دوڑتا ہوا وہاں سے واپس جانے لگا۔

"سیدھے گھر جانا" بڑے بھائی نے آواز لگائی۔ "آج سورج گرہن پڑے گا۔"

اس نے اپنا چوہے جیسا سر ہلا دیا۔

اس کا سر تو ضرور ایک طاعون زدہ چوہے کی طرح بے بس اور مغموم نظر آتا تھا مگر جسم مضبوط اور قد بہت لمبا تھا، اس کے حلئے کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ بھی گمان گزرتا تھا جیسے کسی تندرست و توانا آدمی نے کسی تماشے کے لئے چوہے کا ماسک پہن رکھا ہے۔ یہ ایسا سر تھا جسے دیکھ کر یہ اندیشہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید ابھی ابھی اس کے منہ سے خون کی پتلی لکیر پھوٹنے لگے اور ننھے ننھے دانت اس طرح باہر نکل آئیں جس طرح طاعون میں دم توڑتے ہوئے چوہے کے۔

مگر اس کے دانت بھی ننھے ننھے نہیں تھے، وہ عام دانتوں کے مقابلے کچھ زیادہ ہی بڑے اور چوڑے تھے۔ جب تنہا تھا (ایسا کم ہی ہوتا تھا) تو دیکھنے والوں کو لگتا کہ جیسے یہ دانت

منہ سے باہر نکل خود اس کی ہنسی کو ہی چبا چبا کر نیست و نابود کر رہے ہوں۔

گرمی بہت بڑھ گئی تھی، جون کا مہینہ تھا، جون کی گرمی اور تپش کی انفرادیت ہی یہ ہے کہ وہ بار بار آدمی کے دل کو ایک گیلے تولئے کی طرح نچوڑتی رہتی ہے۔

تیز تیز چلتا ہوا وہ گول ڈاک خانے سے بہت دور نکل آیا تھا۔ سڑک کے چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں،۔ بس تھوڑا آگے چل کر بائیں طرف مڑنے پر کالی ندی کا وہ بوسیدہ پل پڑتا تھا جس کے تین در تھے، برسات کے دنوں کو چھوڑ کر صرف ایک در میں ہی پانی بہتا تھا ویسے کالی ندی کا کیا تھا، وہ تو یہاں بھی بہہ رہی تھی۔ ادھر جھاڑیوں کے پیچھے خاموشی کے ساتھ۔

کچھ دور نکل آنے پر اسے ندی کا پل نظر آنے لگا۔ وہ چونک پڑا مگر اس بار خوف زدہ نہیں ہوا۔ آج وہ اسے تیسری بار نظر آئے تھے۔ وہ پل پر سے جا رہے تھے، قطار بنا کر۔ پیروں میں لمبی لمبی لکڑیاں لگائے ہوئے۔

اسے یاد تھا۔ پہلی بار جب انہیں دیکھا تھا۔ زمانہ گزر گیا۔

خوفزدہ ہو کر اس نے بابو کا ہاتھ سختی سے بھینچ لیا تھا۔

''بابو۔ یہ کیا ہے؟''

''ارے یہ، یہ تو پاسنگ شو سگریٹ کا اشتہار ہے۔ یہ ایک کرتب ہے، نٹوں کا کرتب، یہ اپنے پیروں میں بانس لگا کر چل لیتے ہیں مگر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

وہ اسی طرح بابو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہا۔

وہ سب سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اتنے طویل قامت کہ ان کے سروں کی جوکروں جیسی سفید ٹوپیاں پل کے کنارے لگے بجلی کے کھمبوں کے تاروں کو چھو رہی تھیں۔ وہ گھروں کی دیواروں سے بھی اونچے تھے۔ یہ ایک بھیانک منظر تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ دوسرے ہاتھ میں دبی میٹھے چورن کی پڑیا چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ کہیں بہت دور سے۔

سردی میں بھی نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا پسینہ آ گیا۔

اور دوسری بار اس نے انہیں جب دیکھا تو اس کے بابو کا جنازہ جا رہا تھا۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب میت ندی کے پل پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے وہ آ رہے تھے۔ سفید کپڑے، پیروں میں وہی لمبے لمبے بانس لگائے۔ ایک خاموش جلوس کی شکل میں چلتے ہوئے وہ خود بھی ایک جنازے ہی کی مانند نظر آئے۔

بابو کی میت جب ان کے قریب پہنچی تو وہ سب رک گئے۔ اسے اس وقت احساس ہوا کہ

چار اشخاص کے کاندھوں پر اٹھا کر لے جائے جانے والا میت کا پلنگ ان درجنوں کی تعداد میں، پیروں میں بانس لگا کر چلنے والے مہیب طویل قامت لوگوں سے اتنا نیچا ہو گیا تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔

تب شاید بابو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا تم ڈر رہے ہو۔ یہ ایک کرتب ہے۔ کرتب تب ہی دکھائے جاتے ہیں جب لفظ مر جاتے ہیں اور دنیا کو نیند آنے لگتی ہے۔"

مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ پل کے نیچے بہتی ندی میں شام گر رہی تھی۔ بابو کے جنازے اور ان ہولناک اشخاص کے عکس کالی ندی میں ٹوٹ ٹوٹ کر بہنے لگے۔

وہ نہ جانے کب سے یہیں کھڑا تھا۔ وہ تو پل پر سے نہ جانے کب کے غائب ہو چکے تھے۔ وہاں اب سب طرف سناٹا تھا۔ بچپن میں وہ بار بار اس پل پر سے گزرتا تھا، ویران ساخستہ حال پل۔ دونوں طرف زنگ لگی ہوئی کمزور سی ریلینگ۔ وہ اس کے گزرنے سے ہلتا تھا۔

وہ دن وہ کیسے بھول سکتا ہے۔ پل پر بادلوں کے سائے تھے، اور گزری ہوئی بارشوں کے چھینٹے تھے۔ ریلنگ پر دونوں طرف سفید رنگ کا مانجھا تنا ہوا تھا۔

سڑک نہ جانے کب ہوئی بارش سے بھیگی پڑی تھی۔

اس بھیگی سڑک پر اس کا پیر پھسل گیا۔ اس کی گردن تنے ہوئے مانجھے کے درمیان پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ وہ مانجھا نہیں تھا، ایک چاقو تھا۔ ایک تیز دھار والا بے رحم ہنسی ہنستا ہوا چاقو۔

گردن سے بہتی خون کی دھار کو اپنے دونوں ہاتھوں سے روکتے ہوئے، بارش سے بھیگے اس ہلتے ہوئے پل پر وہ زور زور سے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔ پل کے نیچے بہتی ہوئی کالی ندی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ندی کو اور نہ دیکھ پایا اور آنکھیں موند لیں۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ کھڑی تھی۔ ایک لڑکی جو عمر میں اس سے دو یا تین سال بڑی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل گول اور بیحد سفید تھا۔ اتنا سفید کہ اسے شائبہ گزرا کہ شاید اس میں خون ہی نہیں ہے۔ لڑکی کی دو گھورتی ہوئی آنکھیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس کے چہرے سے لاکھ کوشش کرنے پر بھی نظریں نہ اٹھا سکا۔

ڈاکٹر صاحب نے ٹانکے لگانے اور پٹی باندھنے کی کوئی فیس نہیں لی۔ بوا نے اس کا ہاتھ تھاما اور ان لوگوں کو دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

آہستہ آہستہ اس کا زخم بھرنے لگا، مگر اسے ہلکا ہلکا سا بخار ہو جاتا تھا۔ آواز میں بھی تھوڑی

سی تبدیلی آ گئی تھی۔ دراصل زخم تو بھر رہا تھا مگر ٹانکوں میں کہیں کہیں پس پڑ گیا تھا۔ پس ہمیشہ آنے والے کھرنڈ کا راستہ روک لیتا ہے۔

ان دنوں وہ اپنے پلنگ پر لیٹا لیٹا صرف گول ڈاک خانوں اور گول سفید چہروں کا ہی آپس میں موازانہ کرتا رہتا تھا۔ پھر ایک دن وہ آئی، اس کا حال دریافت کرنے، اس کے ہاتھ میں انگریزی کی ایک کتاب تھی۔

''یہ امی نے تمہیں دی ہے اسے پڑھنا، دل بہلے گا۔'' لڑکی نے کہا اور اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز بھی اس کے چہرے ہی کی طرح سفید اور خون سے خالی تھی۔

لڑکی نے تھوڑی دیر بوا سے کچھ رسمی باتیں کیں پھر یہ کہہ کر کہ وہ کل آئے گی، رخصت ہو گئی مگر دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ دیکھا تھا یا گھورا تھا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

تب تو نہیں مگر اب وہ واضح طور پر یہ جانتا ہے کہ دراصل اس کی آنکھیں ہی ایسی تھیں۔ وہ گھورتی رہتی تھیں۔ وہ کسی شکرے کی آنکھیں تھیں، گھورنے سے ہی ان آنکھوں میں قوت بصارت کا نور پیدا ہو سکتا تھا۔ ورنہ وہ صرف اندھے کی آنکھیں تھیں۔

مگر، بچپن میں وہ یہ سب کہاں جانتا تھا، ان دنوں تو اسے ان گھورتی ہوئی آنکھوں اور خون سے خالی سفید گول چہرے سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ تقریباً روز ہی اس کے گھر آتی تھی مگر باتیں صرف بوا سے کرتی تھی۔ اسے تو صرف گھورتی ہی رہتی تھی۔

وہ اب ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسے بخار بھی نہیں آتا تھا۔ مگر جب وہ اس سفید چہرے کی جانب نظر اٹھاتا تو اسے اپنی ہڈیوں کے اندر پوشیدہ ایک تازہ بخار کا احساس ضرور ہوتا۔ عجیب بات تھی کہ اسے صرف اس کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ کوشش کرنے پر بھی وہاں اور کچھ نہیں دیکھا یا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ بہت ڈھیلے ڈھالے اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کپڑے پہنتی تھی، اس کے پیٹ کی طرف دیکھنے پر لگتا جیسے وہ آنتوں سے خالی پیٹ ہو۔ جیسے وہاں صرف ہوا بھری ہو۔ وہ کبھی کبھی اس کی کہنیوں کی ہڈیوں یا کلائی کی ہڈیوں کو دیکھنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔

وہ گول سفید چہرہ بھی دراصل ایک خالی طشتری ہی کی طرح تھا جس پر اس کی بے حس، گھورتی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی ڈیزائن کی مانند چسپاں تھیں۔ یقیناً وہاں ناک تھی، ہونٹ تھے، تھوڑی تھی اور کان بھی تھے مگر وہ یاد نہ آتے تھے اور اکثر وہ چہرہ انہیں اپنی حبس بھری سفید گول دھند میں چھپا لیتا تھا۔

"شاید وہ مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس لئے گھورتی ہے۔" وہ اکثر سوچتا۔
دراصل گھورنا ایک پراسرار عمل ہے۔ محبت میں، نفرت میں، غصے میں، غور وفکر میں اور یہاں تک کہ بے خیالی میں بھی آنکھوں کو بہر حال گھورنے کا فرض تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے وہ تو پھوٹ کر رونے کا وقت ہی ہے جب آنکھوں کو گھورنے سے نجات ملتی ہے۔
اس لئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا مگر ایک دن آخر اس نے ارادہ کر ہی لیا۔ بڑی ہمت کر کے اس نے ایک سفید کاغذ پر لکھا۔
"مجھے تم سے محبت ہے۔"
پھر اس جملے کو انگریزی میں بھی لکھا کیونکہ اسے یاد آیا کہ وہ انگریزی اسکول میں پڑھتی ہے۔"I love you"
عبارت کے نیچے اس نے بچکانہ انداز میں ایک پھول بھی بنا دیا تھا۔ یہ اس کا محبت نامہ تھا۔ زندگی کا پہلا اور آخری محبت نامہ جسے اس نے لڑکی کی دی ہوئی انگریزی کتاب میں احتیاط کے ساتھ رکھ دیا۔
اس دن صبح سے دوپہر تک بارش ہی ہوتی رہی۔ جب بارش تھمی تو وہ آئی۔ اس کے آنے پر وہ کتاب ہاتھ میں تھام کر دروازے پر کھڑا ہو گیا، اگست کا مہینہ تھا۔ بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی، محلے کے گھروں کی دیواریں اور منڈیریں صبح کی بارش سے بھیگی ہوئی تھیں، مگر اب ان پر سنہری دھوپ چمکنے لگی تھی۔
کچھ دیر بوا سے باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آنے کے لئے نکلی۔
اس نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھا تو چونک گئی۔
"لو اپنی کتاب" اس نے اسی گھرگھراتی ہوئی آواز میں کہا، جو گردن کے زخم کے بعد اس کے حلق سے نکلنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ آواز خود ایک کٹا پھٹا زخم تھا جس میں پس بھر گیا ہو۔
ایک پل کے لئے اس نے خود کو دروازے پر کھڑا ایک ڈاکیہ تصور کیا۔
"اس میں ایک خط ہے" اس نے اپنی پس بھری آواز میں اس طرح کہا جیسے ڈاکیے دروازے پر آواز لگاتے ہیں۔
لڑکی نے کتاب تھامی پھر اس کے اندر سے وہ سفید کاغذ نکالا۔ اس کا سفید گول چہرہ اور بھی زیادہ خطرناک حد تک سفید ہو گیا۔ اس کی گھورتی ہوئی دو آنکھیں اس کے چہرے سے نکل کر اڑنے لگیں، کسی شکاری عقاب کی طرح۔

"میں تمہارے چوہے جیسے نفرت آمیز سر کو دیکھتی تھی۔ میں تم سے نفرت......" لڑکی کی خون سے خالی آواز دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائی۔ اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا پرزہ پرزہ کر کے اس کے منہ پر دے مارا۔ پھر اس کے جسم پر کپڑے اور بھی زیادہ بڑھ گئے۔ اتنے زیادہ کہ اس کے بعد وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکا۔

ٹھیک اسی وقت آسمان پر کہیں سے رینگتا ہوا، گھنا سیاہ بادل آ پہنچا اور دیواروں، منڈیریوں سے چپکی ہوئی دھوپ پٹ کی آواز کے ساتھ ایک حواس باختہ یا مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گر گئی اور سڑک کنارے، کالا پانی لے جاتی ہوئی تنگ نالی میں کسی زرد سانپ کی طرح بل کھاتی، بہتی، نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ سفید چہرہ اس کا اکلوتا اندھیرا بن گیا۔ اس اندھیرے میں ایک تیز دھار والا نفرت آگیں چاقو پھر اس کی گردن پر آ کر ٹھہر گیا۔

پل اب بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ چلتے چلتے وہ وہاں سے دور نکل آیا ہے۔ اب وہ بچہ یا کم سن لڑکا نہیں ہے۔ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی ہے۔ مگر اب بھی اس کے خوابوں میں سبز رنگ کا ایک بڑا سا ڈاک ٹکٹ اڑتا ہوا آتا ہے جس پر وہ گول اور سفید چہرہ بنا ہے۔ ان خوابوں میں جنہیں دیکھ کر سوتے وقت وہ زور زور سے خراٹے لیتا ہے اور کبھی کبھی اس کی بیوی بے رحمی کے ساتھ زور زور سے اس کا شانہ جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہے۔

چلتے چلتے اسے محسوس ہوا کہ تھیلے میں سے کاغذ ڈھیلے ہو کر باہر آ رہے تھے۔ تھیلے کا توازن بگڑنے لگا۔ وہ سڑک پر اکڑوں بیٹھ گیا اور تھیلے کے کاغذوں کو ایک ڈوری سے کس کر باندھنے لگا۔

اور تب اس نے سوچا کہ محبت اور نفرت دونوں اپنی الگ الگ تاریخ لکھتی ہیں۔ دو متوازی تاریخیں اور پھر آخر میں یہ دونوں ایک ہی ڈوری سے بندھ جاتی ہیں۔ کبھی نہ سمجھ میں آنے کے لئے، ایک راز، ایک معمہ بن جاتی ہیں۔

اس نے اپنی گردن کو چھوا، زخم جب بھر جاتے ہیں تو ان کے اندر رہنے والا درد کہاں جاتا ہے۔ کس اندھیرے گوشے میں جا کر چھپ جاتا ہے؟ کیونکہ اس ناقابل معافی دنیا میں کوئی بھی شئے، کوئی بھی کیفیت کبھی مٹتی نہیں وہ صرف اپنا چولا بدل لیتی ہے۔

وہ دوڑ دوڑ کر چل رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ چوبیس سال بعد آج پھر سورج گرہن پڑنے والا ہے۔ مگر دھوپ میں ایک دوسرے قسم کی تیزی ہے۔ ایک شدید احتجاج، ایک تپتا ہوا غصہ،

چاند کے خلاف، زمین کے خلاف، آسمان کے پردے سے باہر آ رہا تھا، دور کسی پنجرے میں بند درندے کی غراہٹ کی طرح۔اس نے اسے واضح طور پر سنا۔

[۳]

قتل کا حلیہ کیسا ہے؟

"بھیا-ڈبے میں کریلے اور روٹیاں رکھ دی ہیں۔مگر ہو سکے تو آج دوپہر سے پہلے ہی گھر آ جانا۔آج سورج گرہن ہے۔" بہن نے بھائی سے کہا تھا۔

"اب جتنی ڈاک ہوگی وہ تو بانٹنا ہی پڑے گی، مگر تم دونوں بچوں کو دوپہر میں گھر سے باہر مت نکلنے دینا۔" اس نے چائے پیتے پیتے جواب دیا تھا۔

"بابو، سورج گرہن میں کیا ہوتا ہے؟" چھوٹے نے باپ کی وردی پر رینگتی ہوئی چیونٹی کو جھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"چاند زمین اور سورج کے درمیان آ جاتا ہے اور سورج کی روشنی کم ہو جاتی ہے۔"

"بابو میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔سورج گرہن دیکھنے؟"

"میں سورج گرہن دیکھنے تھوڑی جا رہا ہوں۔ میں تو اپنی ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔مگر تم دوپہر میں گھر سے مت نکلنا۔اس کے اثرات خراب ہوتے ہیں۔"

وہ اپنی چائے ختم کر کے اٹھ گیا۔اپنی وردی اور ٹوپی کو سنبھالتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑی سائیکل اٹھائی جس کے کیریر میں چھوٹا سا المونیم کا ناشتہ دان لگا ہوا تھا۔

بابو آج ہیرو نظر آ رہے ہیں، یہ وردی ان پر کتنی بجتی ہے۔چھوٹے نے سوچا تھا۔

گیارہ بجے سے لگاتار ڈاک بانٹتے بانٹتے وہ تھک گیا تھا۔اب دوپہر ہو رہی تھی، اس کی سائیکل کچھ دنوں سے بہت بھاری چلنے لگی تھی، پیڈل مارنے میں پیروں کی جان ہی نکل جاتی تھی۔مئی کی دوپہر تھی، لو بہت تیز چل رہی تھی، گرم گرم جھکڑ اس کی وردی کو اڑائے دے رہے تھے اور سائیکل ہوا کے زور سے بار بار پیچھے کی طرف جاتی تھی۔اسے بہت طاقت لگانا پڑ رہی تھی۔ سڑکیں اور گلیاں آج تقریباً ویران تھیں۔ایک تو دوپہر کی وجہ سے اور شاید گرہن کے سبب بھی۔

بس یہ دو منی آرڈر اور پہنچا دوں، پھر آرام سے بیٹھ کر کہیں کھانا کھاؤں گا۔اس نے سوچا، بھوک اور پیاس سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

اب وہ داؤد کے کنویں کے قریب آ گیا تھا جس کے پاس پاکھڑ کا ایک پرانا درخت تھا۔

اسے داؤد کے کنویں کے سامنے والی گلی میں جانا تھا جو آگے چل کر بند تھی۔

تب ہی اسے خیال آیا کہ یہی وقت سورج گرہن کا ہے۔

دھوپ مٹیالی ہوگئی تھی۔ دھوپ کا یہ مٹیالا پن خوشگوار نہ تھا۔ سورج کے سامنے بادل کا کوئی چیتھڑا تک نہ تھا مگر کسی پراسرار سبب سے اس کی چمک کم ہوتی سی محسوس ہوئی۔

ویران دوپہر میں آسمان میں کوئی چیل انڈا چھوڑ رہی تھی۔ ماحول میں ایک عجیب سی ناقابل تشریح قسم کی نحوست طاری ہوگئی۔

وہ سائیکل سے اتر کر پیدل سائیکل کا ہینڈل تھامے اس سنسان بند گلی میں داخل ہوا۔

اس نے دیکھا سامنے تین چار لڑکے کھڑے ایک فحش سا گیت گاتے ہوئے اس کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔

"ہٹ جانا بھائی۔ آگے جانا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"چپ، تیری بہن کی...... نکال کتنے پیسے ہیں تیرے تھیلے میں؟"

"اسے ہاتھ مت لگانا، یہ منی آرڈر کے پیسے ہیں۔ میری جیب میں جو ملے وہ لے لو۔" وہ سہم کر تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"تیری تو ماں کی......" ایک لڑکے نے جیب میں سے لمبا سا چاقو نکالا۔ اس نے ڈاک کے تھیلے کو کس کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

لڑکوں نے مل کر اسے دبوچ لیا اور اس پر پے در پے چاقو کے وار کرنے لگے۔

وہ بڑی ہذیانی چیخیں تھیں مگر اس وقت جیسے انہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ تھیلا چھین کر وہ چاروں داؤد کے کنویں کی طرف بھاگتے چلے گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے ہوئے، چیختے ہوئے داؤد کے کنویں کی طرف دوڑا، مگر پھر اس میں سکت نہ رہی۔ اپنا پیٹ تھامے تھامے وہ جھکتا چلا گیا۔ پھر بے دم ہو کر زمین پر پڑی اپنی سائیکل پر گر پڑا۔

وہ یونہی اپنی سائیکل پر گرا پڑا تھا۔ اس کے پیٹ سے آنتیں نکل کر باہر آ گئیں تھیں۔ اس کے نیچے زمین پر خون کا دھبہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اس خون پر اس کا ناشتہ دان کھل کر الٹ گیا تھا جس میں سے کریلوں کی سبزی اور دو روٹیاں نکل کر اس کے پیٹ سے باہر آ گئیں بھوکی آنتوں سے جا لپٹی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے دم توڑ رہا تھا۔ آسمان اور بھی مٹیالا ہونے کی طرف

جھکا۔ دھوپ یکبارگی کو بالکل مدھم ہوگئی۔ آسمان کی اونچائیوں میں ایک چیل چیخی اور داؤد کے کنویں میں بیٹ کرتی ہوئی، اڑتی ہوئی گزر گئی۔ دور خلاء میں سورج کو گرہن لگا۔ پھر ایک ثانیے بعد دھوپ تیز ہوئی اور تب داؤد کے کنویں کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ادھر چلے آرہے تھے۔

"ارے ڈاکیے کو مار ڈالا، بیچارے غریب ڈاکیے کو" کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا مگر اس کے کانوں میں یہ آواز بہت مدھم سی سرگوشی بن کر آئی اور شاید یہ اس دنیا کی آخری آواز تھی جو اس کے کانوں نے سنی۔

چھوٹے کو صرف اتنا یاد ہے کہ بھری دوپہر میں سڑک پر خون کا ایک بڑا سا دھبہ تھا جو لُو کے گرم تھپیڑوں سے خشک اور سیاہ ہوتا جاتا تھا۔ سائیکل کی گھنٹی، مڈگارڈ، پہیے، تیلیاں، گدی سب پر خون کے چھینٹے تھے۔ بابو کی خاکی رنگ کی وردی خون میں اس طرح لتھڑی ہوئی تھی جیسے مٹی خون سے لتھڑ جاتی ہے۔ اس کو بابو کی شکل نظر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اسی شام جب اسے باپ کی میت کے پاس لے جایا گیا تو وہاں بھی اسے کوئی شکل نہیں دکھائی دی۔ سفید کفن کے نیچے جھانکتا ہوا صرف وہی خون کا بڑا دھبہ ہی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

بہت عرصہ گزر جانے کے بعد کسی مسخرے نے اس سے پوچھا تھا:

"قتل کا حلیہ کیسا ہوتا ہے۔ وہ دیکھنے میں کیا لگتا ہے؟" تب چھوٹے نے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا تھا کہ قتل خون کے رنگ کا ایک ڈاک ٹکٹ ہے جس پر ایک چاقو بنا ہے۔

[۴]

بہروپیہ

جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو بیوی باہر ہی کھڑی مل گئی۔

"آگئے، آج کتنا کمایا؟" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر چہرے سے خوشی کا اظہار کیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے میں آیا پھر وردی اتار کر دیوار پر لگی کھونٹی پر ٹانگ دی۔ پھر سر سے ٹوپی اتار دی اور فرش پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"روٹی کھاؤ گے؟"

اس نے بظاہر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا ہوا اگر تم اپنی ٹوپی ہر وقت سر پر لگائے رہو، ایک تو بالکل گنجے ہو چکے ہو، اوپر سے ٹوپی اتارنے پر تمہارے سر کا چوہا پن کچھ اور نمایاں ہونے لگتا ہے۔" بیوی نے کہا۔

اچانک اس کے چہرے کی خوش دلی غائب ہوگئی۔ اس کے اندر سے اداسی اس طرح نمایاں ہوگئی جیسے رنگے ہوئے بالوں میں سے سفیدی جھانکنے لگتی ہے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا بات ہے، آج کچھ جلدی آ ٹپکے؟"

وہ بیوی کو بغیر پلکیں ہلائے دیکھنے لگا۔ جب بھی وہ اس طرح بغیر پلکیں ہلائے دیکھا کرتا تو محسوس ہوتا جیسے وہ ساری دنیا کو اپنی پلکوں پر ڈھیر کی طرح اکٹھا کر کے بیٹھا ہے اور جب پلکیں ہلاتا تو لگتا جیسے وہ ساری دنیا کو غصے کی آگ میں جلا کر راکھ کر دینے کے لئے بار بار دیا سلائیاں رگڑ رہا ہے۔

"آج سورج گرہن پڑے گا۔ پورے چوبیس سال بعد" وہ افسردگی کے ساتھ بولا۔

"تو۔ تو تم کیا کرو گے؟ کیا کالا چشمہ لگا کر گرہن لگنے کا منظر دیکھو گے؟" وہ درشتی کے ساتھ بولی۔

اس نے بیوی کے درشت لہجے کو محسوس کیا اور یہ سوچنے لگا کہ وہ گرہن لگنے کا ایک منظر دیکھ چکا ہے، چوبیس سال پہلے کا، چشمے کے بغیر مگر آسمان پر نہیں سڑک پر۔

بیوی بھی گویا اس وقت اس کے سر ہی ہوگئی تھی۔

"تمہیں اپنا بہروپیہ پن جتنا دکھانا ہے دکھاؤ، مگر یہ سڑی گلی، اگھور وردی کو تو لے جا کر کوڑے میں پھینک آؤ، اس میں نہ جانے کتنے جو اور پلو پڑ گئے ہوں گے۔ ایسی بھی کیا باپ کی نشانی، تم کیسے اسے برداشت کرتے ہو۔ اس پر تمہارے باپ کے خون کے دھبے تھے جو وردی کے دھلتے رہنے کے ساتھ وقت گزر جانے کے باعث کالے اور جامنی رنگ میں بدل گئے تھے۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے۔ برسات میں پانی میں بھیگ کر اس سے ایسی سڑاند نکلتی ہے کہ قریب کھڑے آدمی کو اپنی ناک پر ہاتھ رکھنا پڑ جاتا ہے۔ بوا نے تو باپ کے مرنے کے بعد ہی خون سے سنی اس منحوس وردی کو پھینک دینا چاہا تھا مگر اس نے ضد پکڑ لی تھی۔

"وردی نہیں جائے گی۔ ہرگز نہیں جائے گی، وردی میری ہے" وہ رو رو کر کہہ رہا تھا۔

آخر بوا کو بن ماں باپ کے اس سنکی سے بچے کے سامنے ہار ماننا ہی پڑی۔

"سنو! پرانے کپڑے فروخت کر کے اب مجھ سے گزر بسر نہیں ہو سکتی" "تم یہ بہروپے پن

چھوڑ کر کوئی ٹھیلہ لگالو۔" بیوی نے اس بار نرمی اور سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔ بیوی کے سانولے ہاتھ پر پھر چند دانے ابھر کر آئے تھے جیسے مچھروں کے کاٹنے سے ہو جاتے ہیں۔

جیسے ہی ان کی نظر ان دانوں پر پڑی اسے اپنے جسم کے اندر ایک جانی پہچانی سی بو کا احساس ہوا۔ ایک ایسی بو صرف شہوت جگاتی تھی اور کھال کے مساموں میں کوئی شے باہر سے آ کر رینگنے لگتی ہے۔ اس کی بیوی نے ایسی بو کو پہچان لیا۔

"ہوش میں رہو" اس نے حقارت کے ساتھ کہا اور اندر چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر یونہی فرش پر بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا اور بوا کو یاد کرنے لگا جسے گزرے ہوئے دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی بوا کی سسرال کی ایک دور کی رشتے دار ہوتی تھی۔ وہ ایک طلاق شدہ عورت تھی جس کے کوئی بچہ نہ ہو سکا تھا۔ بوا نے اسی کے ماں باپ کو پتہ نہیں کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ بیوی کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی ضرور تھیں مگر ان میں کوئی جاذبیت نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اس طرح پھٹی پھٹی تھیں مگر ان میں کوئی جاذبیت نہ تھی بلکہ وہ ہمیشہ اس طرح پھٹی پھٹی سی رہتیں جیسے ان میں تنکا پڑ گیا ہو اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے کسی نے نکلوانا چاہتی ہو۔ دبلی پتلی ہونے کے باوجود اس کے کولہے بھاری اور ضرورت سے زیادہ گول مٹول تھے۔ اس کے پستان چھوٹے اور ڈھلکے ہوئے تھے مگر ان میں گولائی نام کو نہ تھی وہ کچھ لمبوترے سے تھے۔ ایک عجیب بات اس میں یہ بھی تھی کہ اکثر اس کے ماتھے پر ایسے سرخ سرخ دانے ابھر آیا کرتے تھے جو گرمیوں میں نکلنے والی پھنسیوں سے مشابہ تھے یا پھر مچھر کے کاٹے سے۔ ان دانوں کا کوئی وقت یا موسم نہ تھا۔ وہ پراسرار انداز میں کبھی بھی نکل سکتے تھے اور جب وہ نکلتے تو انہیں دیکھ کر وہ جنسی خواہش سے بے قابو ہو جاتا۔ ایک ایسی خالص اور ایماندار جنسی خواہش جس میں محبت کی ملاوٹ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ بس یہی وہ زمانہ ہوتا جب رات کے اندھیرے میں پلنگ پر وہ دونوں وحشیوں کی طرح مضحکہ خیز انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھا پائی سی کرتے جب تک کہ ان کی سانسیں ڈھیلی نہ پڑ جاتیں۔ تب اس کا مضبوط جسم سرخرو ہوتا مگر اس کا چوہے جیسا سر تکیے پر ڈھلک جاتا۔

پھر بیوی اندر والے کمرے میں جا کر سو جاتی جہاں تک اسکے خراٹوں کی آواز نہ آتی تھی۔

یقیناً یہ ایک بھیانک بات تھی مگر ہر ایماندار اور خالص جذبے میں ایک قسم کا ناقابل فہم اور اس کا بالکل نجی بھیانک پن تو ہوتا ہی ہے۔ جس کے لئے اسے معاف کر دینا چاہئے۔

اور یہ تو سب کو عیاں تھا کہ اس کی بیوی کے بچے نہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے

ایک ایسے شخص سے بیاہ دیا گیا تھا جو دنیا کی نظر میں صحیح الدماغ نہ تھا بلکہ شاید پاگل تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ ٹھیک ٹھاک پڑھنے لکھنے کے باوجود اس کو محکمہ ڈاک میں اپنے باپ کی جگہ نوکری نہ مل پائی تھی۔ ہاں اس کے بھائی کو ضرور گول ڈاک خانے میں لئی اور گوند بنانے کی ایک حقیر سی نوکری مل گئی تھی۔ بڑا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتا تھا اور چھوٹے بھائی کے سنکی پن سے اتنا نالاں تھا کہ اس سے تقریباً ہر قسم کا تعلق ہی توڑ رکھا تھا۔

"بہروپیہ۔ بہروپیہ" باہر گلی میں بچوں نے آواز لگائی۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ شاید اسے جھپکی آ گئی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ سورج گرہن گزر چکا تھا۔ شاید ساتھ خیریت کے صرف اس کے ہاتھ پیر کچھ گرم سے تھے۔

"بہروپیہ" باہر بچے پھر چلائے۔

اور یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک بہروپیہ تھا۔ مگر کیسا عجیب بہروپیہ کہ صرف ڈاکیے کا ہی بہروپ بھرتا تھا۔ بچپن سے ہی وہ باپ کی زندگی میں ہی نہ جانے کہاں کہاں کے ڈاک گھروں میں بھٹکتا پھرتا۔ باپ کی چھٹی کے دن وہ اس کی وردی پہن کر ڈاکیے کی نقل اتارتا۔ یہ سلسلہ باپ کے قتل کے بعد رکا نہیں بلکہ پاگل پن میں بدل گیا۔ محلے والے اسے چھیڑا کرتے اور یوں تو شہر میں بہت سے بہروپیے گھومتے رہتے تھے۔ کوئی ڈاکٹر کا بہروپ بھرتا تھا، کوئی وکیل کا، کوئی ٹریفک کے سپاہی کا تو کوئی ڈاکو کا یا چیتھڑے لگائے گھومتے مجنوں کا۔ جو بھی ہو بہروپیے بھکاریوں سے تو بہتر تھے اور انہیں بھکاریوں کے مقابلے زیادہ عزت اور قدر کی نظر سے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ مگر وہ تو صرف ڈاکیے کا ہی بہروپ بھرتا تھا اور کچھ لوگ اسے مجذوب سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ کئی بار پولس بھی اسے غیر ملکی جاسوس ہونے کے شبہ میں پوچھ تاچھ کے لئے تھانے لے گئی تھی لیکن اب اسے سب جاننے لگے تھے۔ وہ تقریباً تمام شہر میں مذاق کا نشانہ بن گیا تھا۔ خاص طور پر محکمہ ڈاک کے لئے، مگر اس سے کیا ہوتا ہے وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ مذاق اڑانے والوں میں اور مذاق کا موضوع بننے والوں میں آپس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہوتا۔ یہ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے اگرچہ دنیا کے سب سے زیادہ دلچسپ اور تفریح کن رشتے کا التباس ضرور پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں قطعی طور پر مختلف دنیاؤں کی مخلوق ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی دو دنیائیں۔ مذاق اڑانے والوں کے سر طاعون سے بیمار چوہوں جیسے نہیں ہوتے اور سوتے وقت انہیں بھیانک خراٹے نہیں آتے۔ وہ ایک الگ دنیا کے بہروپیے ہیں۔

''بہروپیئے...... بہروپیئے۔ کہاں ہو تم''

مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ وہ گھر سے باہر آنے لگا۔ محلے کے بچے اسے دیکھ کر اچھلنے کودنے لگے پھر وہ چلائے۔

''وردی پہن کر آؤ۔ وردی پہن کر آؤ''

وہ واپس گھر میں وردی پہننے کے لئے دوڑا۔

صبح سے شام تک اور کبھی کبھی رات میں بھی یہی اس کا مشغلہ تھا جسے وہ ایک عین اخلاقی فرض کی حیثیت سے سالہا سال کرتا آ رہا تھا۔ بہروپیہ بن کر اپنی دانست میں وہ معاشرے میں مسرت پیدا کر رہا تھا۔ ایک ایسی مسرت جو حیرت زدگی کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ معصوم حیرت زدگی جو صرف اسلئے غائب ہوتی جا رہی تھی کہ خود لوگوں نے نہ جانے کتنے نقاب اوڑھ رکھے تھے۔ معصوم حیرت زدگی بہر حال لوگوں کو اپنے اصل روپ کے اندر تک تو لے جاتی تھی۔ مگر وہ تھا ہی کیا۔ اس کی اوقات ہی کیا تھی۔ وہ تو شاید ایک ڈاکیہ بھی نہ تھا، صرف ڈاکیئے کا بہروپیہ تھا، جو دوپہر، شام، رات ہر وقت گلی کوچوں، ویران علاقوں اور کبھی کبھی کالی ندی کے سنسان اور ویران کناروں پر بھی بھٹکتا پھرتا تھا۔ وہی کالی ندی جو شاید اس کے جسم سے امربیل کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔

ردی کاغذ کے ٹکڑے، بچوں کی ردی میں بیچی گئی کتابیں اور کاپیوں کے اوراق، سودا فروخت کرنے والوں کی اخبار یا بانس کاغذ کی بنی تھیلیاں جس سے وہ جھوٹ موٹ کے پارسل بنا لیتا۔ اس میں جنگلی پھول، گھاس اور کنکڑیاں وغیرہ بھر دیتا تھا۔ کسی غریب بچے کو سڑک کنارے روتا ہوا دیکھتا تو بھاگ کر اس کے پاس آتا اور کہتا لو تمہاری چٹھی آئی ہے۔'' اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا دبا مسلا رنگین کاغذ پکڑا دیتا جس پر کچھ نہ کچھ لکھا ضرور ہوتا تھا کیونکہ تحریر کے بغیر کاغذ کی کوئی اہمیت نہ تھی اور ایک چھوٹا بچہ بھی اس نکتے کو بہر حال بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کے تھیلے میں پرانے رنگین کلینڈر، پرانے شادی کے کارڈ، سال گرہ یا تہواروں کی مبارکباد وغیرہ کے کارڈ بھی رہتے تھے۔ بچوں کی طرح وہ ان بوڑھے ماں باپ کو بھی کوئی نہ کوئی کاغذ یا کارڈ دے کر بہلا دیتا تھا جو اپنی اولادوں کے خطوں کے انتظار میں تقریباً مردہ ہو چکے تھے۔

کیا واقعی یہ ایک قسم کی اداکاری تھی؟ صبح سے شام تک یہ بہروپ بھرنے کے بعد اس کے پاس صرف ایک خالی اور بے معنی دنیا رہ جاتی تھی جو کہ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ ہر عظیم اداکار کا مقدر ہوتی ہے۔ مگر نہیں اس خالی اور بے معنی زندگی میں رات کے وقت اس کے لئے ایک شئے اور پوشیدہ تھی اور وہ تھی اس کے خراٹے۔ یہ کوئی عام خراٹے نہ تھے۔ اس کے سو جانے کے بعد

اس کے قریب لیٹ کر دنیا کے کسی بھی شخص کو نیند نہیں آ سکتی تھی۔ دوسروں کے لئے یہ بیحد خوفناک اور پراسرار خراٹے تھے، ویسے تو یہ بیماری اسے ہمیشہ سے تھی مگر بچپن میں مانجھے سے گردن کٹ جانے کے بعد سے یہ بڑھ گئی تھی اور گزشتہ دو سال سے اس نے بیحد شدت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ خراٹے لینے کی وجہ ناک کے پچھلے حصے، تالو، ٹانسلر اور زبان کی کوئی نہ کوئی خرابی ہوتی ہے۔ دراصل ہوا کا راستہ بند ہو جانے سے آدمی خراٹے لیتا ہے۔ اس کے لئے یا تو تالو کا آپریشن کرانا ہوگا یا پھر ٹانسلر نکلوانا ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو وہ اپنی ظاہری یا جسمانی زندگی کے تئیں اتنا چوکنا تھا اور نہ کوئی دوسرا اس کے لئے یہ دردسر مول لے سکتا تھا مگر ڈاکٹر کا اندیشہ تھا کہ اس طرح کے خراٹوں میں دل پر دباؤ بڑھتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے بھی بھی سانس رک سکتی تھی۔ دل کی دھڑکن بند ہو سکتی تھی اور وہ مر سکتا تھا۔

کبھی کبھی جب اس کے گلے کے غدود بڑھ جاتے تو یہ خراٹے اٹک اٹک کر آنے لگتے۔ کچھ اس طرح جیسے تالو میں ازل سے بیج کی صورت پوشیدہ 'شبد'، ناک اور منہ سے نکلتی ہوئی ہوا کے سہارے باہر آنا چاہتے ہوں۔ کہیں نادیدہ، پراسرار اور عظیم زبان کے حروف تہجی میں شامل ہو کر نیند کی خاموشی کے خلاف ایک بیانیہ کی تشکیل کرنے کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے یہ خراٹے اداس اور دکھی تھے۔ ایسے خراٹے موت کے کتنا قریب تھے اور شاید اس کالی ندی سے بھی جو اس کے شہر میں ہر طرف بہتی پھرتی تھی۔

وردی پہن کر اور کاغذوں سے بھرا ہوا خالی رنگ کا تھیلا لئے ہوئے وہ گھر سے پھر نکلا اور گلیوں گلیوں دوڑتا ہوا گھومنے لگا کسی بچے کے ہاتھ میں کوئی رنگین کاغذ تھماتا ہوا، کسی راہ گیر کے کسی ایسی شادی کا کارڈ دیتا ہوا جس کی تاریخ نکل چکی تھی۔ ایک سچے بہروپیے کی طرح اپنا فرض پورا کرتے ہوئے وہ دوڑ دوڑ کر اپنی 'ڈاک' بانٹا کرتا۔ دوڑنے میں اس کی سانس بری طرح پھول جاتی تب وہ دم بھر کو سڑک کنارے یا کسی دکان کے پشتے پر بیٹھ جاتا۔ مگر آہستہ چلنا اس کے بس کی بات نہ تھی، شاید اسے معلوم تھا کہ جدید انسان کے ارتقا میں دوڑنے کا کتنا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ دوڑنے میں انسانوں کی گردن اور ریڑھ کی ہڈیوں کے گریوں نے تمام دھچکے برداشت کرنا سیکھ لیا۔ دونوں بانہوں اور کاندھوں نے توازن برقرار رکھنے کا کام انجام دیا ہے اور یہ انسانی کولہے ہی تو ہیں جو دوڑتے وقت تیزی سے مڑنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ قدیم انسان جب درختوں سے نیچے اترے تب دوڑ کا سلسلہ شروع ہوا۔

مگر وہ اور بھی تیز دوڑنا چاہتا تھا۔تقریباً اڑنا چاہتا تھا مگر کسی پرندے کی طرح نہیں بلکہ ایک پاگل ہوا کی طرح — آزاد۔

وہ اکثر سوچا کرتا کہ زمانہ ایک چھٹی رساں کے قدموں کے بنائے ہوئے راستوں پر کیوں نہیں چلتا۔

اور یوں تو زمانہ قیامت کی چال چل گیا تھا۔

وہ بہت تیز رفتار ہو گیا تھا۔مگر انسانی جسم کی حرکت و رفتار تقریباً ایک مردے کے جسم کے برابر ہی رہ گئی تھی۔جسم نظر آتے تھے۔پہیوں پر بیٹھے بے جان مورتیوں کی طرح۔پہیے ہوا سے باتیں کرتے تھے۔انسانی جسم نہ ہلتا تھا۔اس کو پسینہ تک نہ آتا تھا۔نظر نہ آنے والی قوت کے کاندھوں پر سوار پل بھر میں لوگ ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔صرف ان کی انگلیاں ادا کے ساتھ ہلتی تھیں اور اس کے خیال میں یہ ایک فحش بات تھی۔سب کچھ مایوس کن حد تک خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔

یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت تھی کہ لوگ اب اس کے اس بہروپ سے تقریباً اکتا گئے تھے پھر بھی بھکاریوں کی طرح دن بھر میں اسے چند پیسے مل ہی جایا کرتے، جن سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ ان پیسوں سے پرچون کی دکان پر جا کر ردی کاغذ خرید لاتا۔ گھر کا خرچ، بیوی ہی چلا رہی تھی، وہ بڑے شہر جا کر وہاں سے پرانے کپڑے خرید لاتی اور یہاں غریب گھروں میں بیچ آتی۔مگر پرانے کپڑوں میں آج تک اسے کبھی ڈاکیے کی وردی بھولے سے بھی نہ مل پائی۔ہاں کچھ سال پہلے پرانے کپڑوں میں اسے ایک بوسیدہ سے رنگ کا کوٹ ضرور مل گیا تھا۔یہ کوٹ کسی ایسے شخص کا رہا ہوگا جسے موٹاپے کی بیماری ہو، جاڑوں میں کبھی وہ اسے پہنتا تو اس کا سارا جسم اسی میں چھپ جاتا۔وہ اس کوٹ میں بھوسا بھرا ہوا ڈی نظر آتا اور جس طرح بھوسا بھرے شیر کی بے چارگی صاف اس کے منہ سے عیاں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اس کا چوہے جیسا سر مضحکہ خیز انداز میں بے چارہ ہو جاتا۔

اور لوگ — وہ بہروپیے، تو کیا، دراصل ڈاکیے سے ہی اکتا گئے تھے اور خود ڈاکیہ بھی اپنے وجود کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے لوگوں کی زندگی سے نکل کر حاشئے پر آ گیا تھا۔وہ بس اے سمن، قانونی نوٹس، شیئر مارکیٹ کے بانڈ، ٹیلی فون کے بل، منی آرڈر اور کچھ میگزین وغیرہ ہی ادھر سے ادھر ڈھوتا نظر آتا تھا۔بمشکل ہی کسی کے پاس کوئی خط ہوتا تھا۔لوگوں نے خط لکھنا ہی چھوڑ دئے تھے۔دنیا کی ہڈیاں، سکڑ گئی تھیں، وہ بونی ہو گئی تھی جس پر کروڑوں کی تعداد میں انسان اس

طرح چمٹے ہوئے تھے جیسے مٹھائی پر چیونٹیاں اور مکھیاں، بس ایک بالشت بھر کی دوری رہ گئی تھی جس میں دنیا کو سر سے پاؤں کو چھوا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو صرف خبروں کی ضرورت تھی۔ وہ دنیا پر برس رہی تھیں۔ لوگ خبروں کے جراثیم کی طرح تھیں، کسی پیغام یا ہدایت کی نہیں۔ خبریں پلیگ کے زہریلے جراثیم کی طرح تھیں، وہ دنیا پر برس رہی تھیں، لوگ خبروں کے اس لئے خواہاں تھے کہ وہ اپنی موت میں دوسروں کی شمولیت بھی چاہتے تھے، وہ وبا میں مرنا پسند کرنے والے لوگ تھے اور یقیناً انفرادی موت سے اجتماعی موت کی طرف بھاگنا قدرے عافیت کی بات تھی۔

ویسے تو ڈاکیہ ہمیشہ ہی انسانوں کے پیغامات، ان کے دکھ سکھ کو ایک دوسرے تک پہنچانے میں اپنی انفرادی شخصیت اور ساخت قربان کرتا آیا ہے، اس کی شکل سیال ہو کر بہتی ہے۔ تم اس کا اکثر نوٹس نہیں لیتے کیونکہ وہ انسانوں کے شادی و مرگ کے کاغذوں کے حساب کتاب ڈھوتے رہنے میں تجریدی ہو جاتا۔ ڈاکیے گلی میں گونجتی ہوئی وہ آوازیں ہیں جن کے ہم عادی ہو گئے ہیں یا آسمان پر آوارہ گردی کرتے ہوئے وہ بادل جن سے بھیانک بارش کا کوئی امکان نہ ہو اور اس لئے وہ اپنے حصے کا رعب اور وقار کھو چکے ہیں۔

اسے یاد ہے وہ بابو کے ساتھ شادی کی ایک تقریب میں گیا تھا، ایک شاندار سجی سجائی محفل جہاں بابو مٹی کے رنگ کی وردی پہنے خاموش کھڑے تھے، وہ سہما سہما ان کی انگلی تھامے تھا۔ محفل میں بابو کے ہاتھ پر صرف ایک نوٹ رکھ دیا گیا تھا۔ فضا میں چاروں طرف دیسی گھی کی کچوریوں کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ اس کا دل کچوری کھانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ مگر دعوت اور آؤ بھگت کے وہ دونوں باپ بیٹے حقدار نہ تھے۔ انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ کیسی عجیب بات تھی کہ جن مسرتوں اور تقریبوں کے پیغام اور بلاوے وہ ساری دنیا میں بانٹتے پھرتے تھے، انہیں میں شرکت کے لئے ان کے پاس نہ کوئی بلاوا تھا اور نہ ہی کوئی مقام......!

گلیوں گلیوں بھٹکتے، وہ اچانک شہر کے سب سے رونق افزا بازار والی سڑک پر آ نکلا۔

سڑک کے دونوں طرف نیون بلب، اونچے کھمبوں میں سڑک کی طرف منہ کئے اپنی روشنی پھینک رہے تھے۔ سڑک روشن تھی۔ اس پر گری باریک سے باریک سوئی بھی نظر آ سکتی تھی۔ دکانوں کے سائن بورڈ رنگین بدلتی ہوئی روشنیوں میں جھلملا رہے تھے۔ کاروں، بسوں اور موٹر سائیکلوں کا جم غفیر تھا۔ اس بھیڑ میں فیشن ایبل، نیم عریاں گداز بدن والی پکی پکائی عمر کی عورتیں سب سے زیادہ نمایاں تھیں، خوشبوؤں کے ریلے اڑ رہے تھے، فٹ پاتھ پر آئس کریم اور چاٹ

کے ٹھیلوں کے برابر ایک غبارے والا کھڑا تھا۔ وہ یہ منظر دیکھ کر سحر زدہ سا ہو گیا۔ اگر چہ سینکڑوں بار ادھر سے گزرا تھا مگر آج اس سڑک کی رونق کچھ دوسری طرح کی تھی۔

ٹھیک اسی وقت ایک عجیب سی گھر گھراہٹ سنائی پڑی، جیسے سڑک پر کچھ گھسیٹا جا رہا ہو اور تب اس نے دیکھا:

دور سڑک پر سامنے سے کوڑھیوں کی گاڑیاں قطار باندھے چل رہی تھیں، لکڑی کی گاڑیاں جن میں بال بیئرنگ کے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے تھے۔ ان گاڑیوں کی اونچائی سڑک سے بس اتنی ہی تھی جتنی ایک خاص نسل کے کتے کے پیٹ کی زمین سے ہوتی ہے۔ گاڑیاں مہیب اور کریہہ آوازوں کے ساتھ گھسٹتی ہوئی قریب آ گئیں۔ کوڑھی مرد اور عورت انہیں کھینچ رہے تھے۔

مگر اس دہشت ناک منظر سے الگ ایک اور منظر بھی تھا۔ یا شاید منظر نہ ہو کر منظر کو کھرچتی ہوئی ایک لکیر۔ ایک خراش کسی کسی گاڑی میں کوڑھیوں کے معصوم بچے بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں گیس کے غبارے دبے ہوئے تھے۔ یقیناً کوڑھیوں نے بھی اپنے بچوں کے لئے رنگین غبارے خریدے تھے۔

بازار رواں دواں تھا۔ تمام افراد ان گاڑیوں سے بچ کر نکل رہے تھے۔ مگر کوڑھیوں کے بچوں کے ہاتھ میں تھمے اونچے اٹھتے ہوئے گیس کے وہ رنگین غبارے جیسے ساری دنیا کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ زندگی کا بھی اور خود اپنا بھی مضحکہ۔

اس نے خود کو شدت سے اداس محسوس کیا۔

اس کے تھیلے میں ایسا کوئی کاغذ نہیں تھا جو وہ ان سڑتی گلتی انگلیوں میں تھما سکتا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بہروپیے پن، کی لاحاصلی کا علم ہوا۔

گاڑیاں آہستہ آہستہ اپنی دہشت سڑک پر گراتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئیں اور تب اس نے بے اختیار چیخ کر کہا۔

"میں وہ رقعہ جلد ہی لے کر آؤں گا جس میں تمہارے جسم کی کھال کو کندن کی طرح دمکنے کی خبر دی جائے گی۔ تمہاری سڑی اور ناپاک انگلیاں سیدھی اور پاک ہو جائیں گی۔ چہروں پر ستواں ناک جگمگائے گی۔ بس اپنے بچوں کے ہاتھوں میں غبارے تھمائے رکھنا، یہ غبارے اونچے اڑتے اڑتے ایک دن آسمان تک پہنچیں گے اور خدا کو تمہاری داستان سنائیں گے......"

مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ سے جو الفاظ باہر آ رہے ہیں، ان پر لگاتار حلق کے

بڑھے ہوئے غدود کا دباؤ پڑ رہا ہے۔اس لئے ان کی آواز محض ایک بھیانک خراٹے سے مشابہ ہے۔اسی لئے اپنی اپنی گاڑیاں گھسیٹتے ہوئے کوڑھیوں نے اسے نہیں سنا۔یا اگر سنا بھی ہوگا تو اس آواز کو بھی اپنی گاڑی کے پہیوں سے نکلنے والی کریہہ آواز ہی سمجھا ہوگا۔

اسے لگا جیسے تیز بخار چڑھ رہا ہو۔

دور چمکتی ہوئی روشنی میں کوڑھیوں کی گاڑیوں کے بدنصیب سائے، بے ہنگم انداز میں سڑک پر پڑتے نظر آئے پھر وہیں کہیں دب کر رہ گئے۔

اس رات جب سویا تو خراٹوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ دوسرے کمرے میں لیٹی بیوی کو وہاں تک آتی رہی اور وہ وہاں بھی چین کی نیند نہ سو سکی۔اس بار خراٹوں کے ساتھ ان کی ہمزاد کھانسی بھی تھی۔بار بار گلے میں پھندا میں لگاتی ہوئی کھانسی،شاید اس کے حلق کے غدود بڑھ کر سوج گئے تھے کیونکہ رات بھر اسے بخار بھی رہا۔گرمی اور حبس اپنی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔پوری رات جی کو متلا کر رکھ دینے والی گرمی کے منحوس سائے میں ہی گزر گئی۔

صبح جب وہ دیر سے اٹھا تو بیوی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہا،وہ جانتا تھا کہ ماتھے پر ہاتھ رکھنے کے پیچھے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

"تمہارا ماتھا جل رہا ہے،اور گھومو ایسی قیامت کی گرمی میں"

"تم نے مجھے اٹھایا نہیں۔دن چڑھ آیا" اس نے اپنی گھر گھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"مجھے کیا پڑی تھی کہ اٹھاتی۔کیا اپنی کمائی لا کر مجھے دیتے ہو۔ویسے بھی رات اتنے خراٹے لئے ہیں اور اتنا کھانسے ہو کہ جینا دوبھر کر دیا" بیوی کا لہجہ بدل گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے کاغذوں کے تھیلے کو فرش پر پلٹ دیا اور ایک سے ایک الم غلم شے کو اٹھا کر اس طرح قرینے سے لگانے لگا جیسے کسی دفتر کا بابو فائلیں لگاتا ہے۔بیوی نے اس کی طرف نفرت سے گھورا،پھر تیز تیز چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں گھس گئی جہاں اسے پرانے کپڑے سلیقے سے لگا کر گڈی میں باندھنا ہے۔

اور تب اس کی نظر تھیلے سے نکلی اخبار کے کاغذ کی بنائی ہوئی ایک تھیلی پر پڑی۔وہ چونک پڑا۔اس پر ایک بچی کی تصویر تھی۔آٹھ نو سال کی بچی،گھٹنوں تک فراک پہنے،بچی کا چہرہ بیحد اداس تھا،بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں شاید آنسوؤں کی نمی تھی۔بال بکھر کر اس کے ماتھے پر آرہے تھے۔تصویر کے نیچے ایک عبارت تھی:

" سات سال کی یہ بچی اپنی چٹھی کی تلاش میں ایک سال سے شہر کے ہر ڈاک گھر میں چکر لگاتی گھوم رہی ہے۔ 'روشنی' نام کی یہ بچی ستیہ پرکاش سنگھ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ستیہ پرکاش نے سال بھر پہلے سنٹرل جیل عزت نگر میں خودکشی کر لی تھی۔ اس پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام تھا، کہا جاتا ہے کہ ستیہ پرکاش نے یہ چٹھی اپنی خودکشی سے پہلے جیل کے کسی کارکن کے ذریعہ اپنی بچی کے نام پوسٹ کروائی تھی۔ جیل کے کارکن کا بیان ہے کہ وہ چٹھی روشنی کی سالگرہ کا کارڈ تھی۔ مگر سالگرہ کی یہ مبارکباد محکمہ ڈاک کی گھٹیا اور غیر ذمہ دارانہ کارکردگی کی وجہ سے آج ایک برس بیت جانے پر بھی روشنی کو نہ مل سکی۔ محکمہ ڈاک کا بیان ہے کہ شاید وہ چٹھی ڈیڈ لیٹر بن گئی ہے اور اسے آسانی سے اب تلاش کرنا ممکن نہیں ہے، ادھر روشنی ماں باپ کے نہ رہنے اور چٹھی کھو جانے کے غم میں تقریباً پاگل ہو چکی ہے۔ وہ نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے بس صبح سے لے کر شام تک چھوٹے بڑے ہر طرح کے ڈاک گھروں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ نائب وزیر برائے امور خزانہ نے بچی کی پرورش اور تعلیم کے لئے اپنے فنڈ میں سے ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ معصوم روشنی کو اپنے باپ کی طرف سے اپنی سالگرہ کی مبارکباد مل پائے گی یا نہیں۔"

وہ بری طرح بے چین ہو گیا۔ اس کے جسم کا سارا ابخار اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اتر آیا اور اس کا چوہے جیسا سر آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہلنے لگا، وہ تیزی سے فرش پر سے اٹھ گیا۔ سامنے سادہ ورقوں والی وہ کاپی رکھی تھی جس میں اس کی بیوی پرانے کپڑوں کے خرید و فروخت کا حساب لکھواتی تھی۔ اس نے کاپی میں سے ایک سادہ ورق پھاڑا، کچھ لکھنے کے لئے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائیں۔ کوئی قلم، پنسل، افسوس کہ کوئلے کا ٹکڑا تک نہ تھا۔ وہ گھبرانے سا لگا۔ اب اور زیادہ وقت برباد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے سوچا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے پلنگ پر تکئے کے اوپر بیوی کا ہیر پن پڑا ہوا ہے جس میں بیوی کے دو تین کھچڑی بال پھنسے ہوئے تھے۔ اس نے جھپٹ کر ہیر پن اٹھایا اور پوری طاقت کے ساتھ اپنی بائیں ہتھیلی میں بھونک دیا۔ لال لال خون آہستگی کے ساتھ رسنے لگا۔ تب اس نے دوسرے ہاتھ کی کلمے کی انگلی کے پور کو اس خون سے تر کیا اور سادہ ورق پر لکھا۔

" پیاری بیٹی روشنی کو، جان نچھاور کرنے والے باپ کی طرف سے جنم دن بہت بہت مبارک ہو۔" ——— ستیہ پرکاش۔

پھر اس نے عبارت کے نیچے خون سے گلاب کا ایک پھول بھی بنا دیا۔ ورق کو پھونک مار کر سکھانے کے بعد اسے احتیاط کے ساتھ کھونٹی میں ٹنگی وردی کی اندرونی جیب میں رکھ دیا۔ اس

کے بعد اخباری کاغذ کی اس تھیلی کو ہاتھ میں تھامے تھامے دروازے کی طرف دوڑا مگر اسے خیال آیا کہ اس نے وردی تو پہنی ہی نہیں ہے۔

تب بہروپیے نے ڈاکیے کی وردی پہنی، سر پر ٹوپی لگائی اور ہو بہو ڈاکیا سا ہی نکل کھڑا ہوا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ موسم دم گھونٹ دینے کی حد تک حبس زدہ تھا...... ماحول اور فضا میں بیحد دھول اور دھند تھی۔ ایسا گمان ہوتا تھا جیسے ساری دنیا جو مٹی سے بنی تھی، وہ آہستہ آہستہ کھرچی جا رہی تھی، توڑی جا رہی تھی، بالکل اس طرح جیسے مٹی کی کسی عظیم الشان مورت کے توڑنے پر دھول کا ایک غبار اٹھتا ہے۔ ہوا کا تو نام بھی نہ تھا جو بھی ہوا تھی وہ اس کی اپنی تھی اور اس کے دوڑنے سے پیدا ہوتی تھی۔

اور وہ دوڑ رہا تھا۔ ریل سے کٹے ایک بد بخت ڈبے کی طرح جو ویران راتوں میں ریل کی پٹریوں پر اکیلا ہی دوڑتا تھا۔ بغیر انجن کے آج اس کے ساتھ بچوں کی بھیڑ نہ تھی۔ سڑکیں، گلیاں ویران پڑی تھیں۔

بار بار وہ اخبار میں چھپی اس بچی کی تصویر دیکھتا۔ اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا پھر ادھر سے ادھر نکل جاتا۔ وہ دھند سے بنے ایک بگولے کی طرح چکرا رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اپنا وقت برباد کر رہا ہے، بچی کسی ڈاک خانے پر ہی ملے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ کالی ندی کے پل پر بے تحاشہ بھاگنے لگا۔ پل سے ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر ہی وہ چھوٹا سا گول ڈاک خانہ تھا جہاں اس کا بھائی لئی اور گوند بنانے کا کام کرتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس چھوٹے سے ڈاک خانے کے اندر کہیں سرنگیں تھیں جو کہ زمین کے اندر ہی اندر کائنات کے سارے ڈاک خانوں سے جا ملتی تھیں۔

اتنا تیز تیز دوڑنے پر بھی آج ڈاک گھر آتا نظر نہیں آیا۔ کدھر گیا؟ اس نے فکر مند ہو کر سوچا۔ اب اسے احساس ہوا کہ پل پار کرنے کے بعد وہ غلط سمت کو نکل آیا ہے۔

وہ حواس باختہ ہو کر واپس مڑا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ دھند اور مٹی کا غبار اور دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سانسیں بری طرح پھولنے لگیں۔ اس کی ناک اور آنکھوں میں دھول بھر گئی تھی۔ اسے کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور سینے میں نہ سماتی ہوئی سانسوں کو درست کرنے لگا۔ اس کے منہ اور ناک سے مٹی کی بو آتی تھی۔

وہ پھر دوڑنے لگا، اور تب دور وہ نظر آیا۔ وہ پرانا چھوٹا سا گول ڈاک خانہ، وہ امید سے بھر گیا جلدی جلدی بھاگتے ہوئے وہ اس تک پہنچ گیا۔

گول ڈاک خانہ دھند اور دھول کے پیلے غبار میں لپٹا خاموش کھڑا تھا اس کے صدر دروازے پر ایک موٹا سا زنگ آلود تالا جھول رہا تھا۔

اف! آج اتوار تھا۔ اس نے افسوس اور صدمے کے ساتھ سانس بھری اور ڈاک خانے کی زرد دیوار سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔

اب روشنی کو وہ کہاں تلاش کرے، روشنی کہاں ہوگی؟ ایسی بے رحم اور بے حس دنیا میں وہ اپنے باپ کی چٹھی کا انتظار کر رہی ہے مگر کہاں؟ کدھر؟

اس کے جی میں آیا کہ وہ گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے مگر وہ جانتا تھا کہ وہ سب اس وقت بھی نیند میں ڈوبے ہوں گے۔ یہ شہر تو مرگی کے ایک مریض کی طرح تھا جہاں ہر شخص بیہوش تھا یا ایک پاگل نیند کا عادی، افسوس کہ ایسے شہر میں کوئی خط، کوئی پیغام یا کوئی تہنیت نامہ کس طرح دیا جا سکتا تھا۔

بہر حال، وہ پھر اٹھا۔ اسے اپنا فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس بار تیز تیز چلتے ہوئے اسے غیر معمولی تھکن کا احساس ہوا۔ سامنے دور تک سنسان سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ کاش کہ وہ اڑ سکتا! مگر بعد میں اس نے یہ بھی سوچا کہ اسے اپنے جسم پر "پر" نہ ہونے کا افسوس نہ کرنا چاہئے، پرندے ارتقا کے سفر میں انسان سے اس طرح پیچھے رہ گئے تھے جس طرح فرشتے۔

اسے یاد آنے لگا کہ کسی دن کوئی کہہ رہا تھا کہ ڈاکیے کی وردی اب بجائے خاکی کے نیلی ہوا کرے گی۔ مگر اسے یہ منظور نہیں، کیونکہ ڈاکیہ نیلے آسمان سے پر لگائے زمین پر اترتا ہوا کوئی پیغام رساں نہ تھا۔ وہ خلاء سے نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکیہ تو زمین کا بیٹا تھا، وہ زمین سے زمین پر ہی چلتا تھا۔ اس لئے اس کو تو مٹی اوڑھے ہوئے ہی گھومتے رہنا چاہئے جو کہ زمین کا رنگ ہے۔

اچانک وہ پھر تیز تیز دوڑنے لگا۔ دوپہر گیا، سہ پہر گزر چکی تھی اور اب تو شام قریب تھی اگر چہ دھند کی ایسی چادر کے نیچے وقت اپنے خدوخال مسخ کر چکا تھا۔

اس کا سارا دن اس طرح بھٹکتے بھٹکتے ختم ہو گیا۔ شہر پر مٹی برس رہی تھی، جس میں وہ خود بھی خاک، دھول اور مٹی کا ایک چلتا پھرتا پتلا کہیں نظر آ رہا تھا۔

اچانک سامنے اسے کالی ندی بل کھاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ بھٹکتے بھٹکتے ندی کے کنارے آ نکلا تھا۔ کنارے ویران پڑے تھے۔ وہ رک گیا۔

اب بارش ہونا چاہئے۔ اس نے خواہش کی صرف بارش ہی زمین سے آسمان تک تنے ہوئے مٹی کے اس مہیب پردے کو دھو کر مٹا سکتی تھی۔

اور یقیناً وہ آ رہی تھی۔ اسے بارش کی آہٹ سنائی دی وہ کہیں دور ہو رہی ہو گی مگر اس کے آگے آگے چلنے والی ہواؤں کا ایک اداس، ٹھنڈا جھونکا ادھر کو آ نکلا۔

اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ ایک بوند اس کے ماتھے پر گری اور پھر کوندے، گرج چمک اور تیز ہواؤں کے ساتھ وہ خاک اور دھول کے اس خواب غفلت میں مبتلا شہر پر برسنے لگی۔ بارش نے پانی سے بنے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے دھند کو مسل کر رکھ دیا۔ کالی ندی کے کنارے کی زمین دلدل بنتی جا رہی تھی۔ پانی کے زور سے ندی میں جیسے سیلاب آ گیا تھا۔ اس سیلاب کا پانی اس طرح زمین پر پھیل رہا تھا جیسے گھاس کو چرتا ہوا جانور۔

تیز ہوا میں اس کی وردی اڑی جا رہی تھی۔ اس نے تصویر والا اخبار سنبھال کر وردی کی جب میں رکھ لیا۔ اندھیرا ہو گیا اب اسے راستہ نہ سوجھ رہا تھا۔ مگر اب واپس جانا ناممکن تھا۔ واپس جانے کے لئے گھونگھے کی مانند رینگنا ضروری تھا۔ ارتقا کے ٹوٹے ہوئے پیر صرف آگے کی طرف گھسٹ سکتے تھے۔ گوشت کے لوتھڑوں کی طرح لڑھکتے ہوئے ہی سہی، مگر آگے کی طرف۔

دکھ اس کے اندر اس طرح اکٹھا ہو گیا جیسے کسی گڈھے میں پانی اور تب اس نے اپنے پیغمبر ﷺ کو یاد کیا، جبرئیلؑ کو یاد کیا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرشتے جبرئیل جن کے بازوؤں میں پر تھے اور جو اللہ کے کلام کو اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچاتے تھے۔ اس نے اللہ کے رسول سے مدد کی دعا مانگی کہ ستیہ پرکاش کا پیغام 'روشنی' تک پہنچ جائے۔

اسے اب اپنی بائیں ہتھیلی میں سخت درد محسوس ہوا۔ ہتھیلی پھول کر کپا ہو گئی تھی۔ وہ بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑے بارش اور ہوا کے سخت دباؤ سے جیسے پھٹنے لگے۔ اس کا بخار اس کے جسم پر گرتی ہولناک بارش کے نیچے دبا چلا پڑا تھا۔

اب اسے ایک بھیانک نیند آتی محسوس ہوئی مگر نیند کا یہ غلبہ شاید صرف اس کے جسم پر تھا اس کی روح کو تو اس نیند کے خلاف چلتے ہی جانا تھا۔ اس لئے اس کی آنکھیں بار بار نیند سے چپک چپک کر چھوٹ جاتی تھیں۔

[۵]

دلدل میں چاقو

رات تقریباً آدھی بیت گئی تھی جب کچھ آدمی اسے اس حالت میں گھر لے کر آئے کہ

اس کے منہ سے خراٹے جاری تھے۔ بارش نے رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔ اس کی وردی کیچڑ اور پانی میں سنی ہوئی تھی۔ بیوی نے حراساں ہو کر جب اس کی وردی اتار کر کھونٹی میں ٹانگی تو پانی میں بھیگ جانے کے سبب اس میں سے ایسی بدبو آ رہی تھی جیسی اصطبل میں سے آتی ہے۔

وہ سیدھا سیدھا پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ بائیں ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا زخم تھا مگر ہتھیلی اتنی سوج گئی تھی کہ وہ کسی انسان کی نہ ہو کر کسی عفریت کی ہتھیلی معلوم ہوتی تھی۔

کچھ لوگوں نے مل کر اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر سوکھے کپڑے پہنا دیے اور ایک چادر سے اس کے جسم کو ڈھک دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور منہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ جس سے بلند آواز میں وحشت ناک خراٹے لگاتار آئے چلے جا رہے تھے۔

ذرا بارش کا زور کم ہو تو ہم ڈاکٹر کو لے کر آتے ہیں" کوئی بولا۔

کھونٹی کے نیچے جہاں اس کی وردی سے ٹپکتا ہوا پانی فرش کو گیلا کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اس جگہ کو ایک کپڑے سے پونچھنے لگی۔ اسی وقت اس نے اخباری کاغذ کی ایک بڑی سی تھیلی کو دیکھا جو پانی میں بھیگ کر گلی ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ احتیاط کے ساتھ ہتھیلی اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

کوئی تصویر تھی جس کے نقش و نگار بارش کے پانی نے اپنے اندر جذب کر لئے تھے۔ تصویر کے اوپر اخبار کی تاریخ قدرے مٹ جانے کے باوجود پڑھی جا سکتی تھی۔

وہ آج سے ٹھیک چودہ سال پرانا اخبار تھا۔

بیوی نے ہتھیلی اٹھائی اور کمرے سے باہر آنگن کی موری میں پھینک دی۔

"اسے جھنجھوڑ کر ہوش میں لائیں؟" کسی نے آہستہ سے کہا تھا۔

"نہیں۔ ڈاکٹر کو آنے دو۔"

مگر کیا وہ واقعی بے ہوش تھا؟

اگر یہ ممکن تھا کہ کسی کا عکس آئینے میں نظر نہ آئے اور آئینے سے کہیں بہت دور جا کر بھٹکے تو شاید اس کا عکس بھی کہیں اور بھٹک رہا تھا وہ تو دلدل پر بنے ایک چھوٹے سے ڈاک بنگلے کے سامنے ہاتھ میں ایک خط لئے کھڑا تھا۔ یہ ڈاک بنگلہ جس کی بناوٹ گرجا گھروں کی سی تھی۔ ڈاک بنگلے کے اندر ایک کمرے میں ایک لڑکی کمپیوٹر پر بیٹھی تھی اور اس کے کان میں ایک سیل فون لگا تھا۔

لڑکی کا چہرہ بیحد گول اور سفید تھا۔ اتنا سفید کہ جیسے قلت خون کا مارا ہوا ہو۔ وہ کمرے سے

باہر آئی۔ دروازے پر سر جھکائے وہ خاموش کھڑا تھا۔

"آپ کے شوہر نے آپ کو یہ محبت نامہ بھیجا ہے" اس نے لڑکی کی طرف ایک کاغذ بڑھایا۔ جس پر "مجھے تم سے محبت ہے" لکھا ہوا تھا اور نیچے بچکانہ انداز میں ایک پھول بھی بنا تھا۔

لڑکی مسکرائی اور شرماتے ہوئے اس کے ہاتھ سے خط لیا۔

اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن رکھے تھے مگر اس کے پیٹ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے آج اس میں آنتیں واپس آ گئی ہوں۔

پھر لڑکی نے لگاوٹ سے اسے گھورا۔ ان آنکھوں میں پیار کرنے کی جنگلی سی خوشبو اتر آئی۔ لڑکی نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کے تپتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی خاکی وردی جنگلی پھولوں کی خوشبوؤں سے بھر گئی۔

وہ دونوں یونہیں ایک دوسرے کی بانہوں میں سمائے دلدل میں دھنسنے لگے۔ دلدل کے نیچے پانی میں دھوپ کھلی ہوئی تھی جس طرح کسی مکان کی کھودی گئی بنیادوں میں دھوپ چمکتی ہے۔

دلدل کے نیچے موجود پانی میں۔ گہرے پانی میں انہوں نے ایک دوسرے سے جی بھر کر پیار کیا۔ لڑکی کے بدن پر بہت کپڑے تھے۔ مگر اس کے بڑے بڑے پستان کپڑوں سے باہر نکل رہے تھے۔ پستانوں سے دودھ کی ایک سفید نہر دلدل پر بہتی جاتی تھی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ پانی سے اوپر آنے لگے۔ ساری کائنات ہی جیسے پانی سے ابھر رہی تھی۔ زندگی آ رہی تھی، پانی سے نکل کر زمین کی طرف۔

کائی سے لتھڑ کر دونوں کے جسم ہرے ہو گئے تھے۔

"تم مجھ سے پیار کرتی تھیں؟"

"ہاں"

"ماچھے سے میرا گلا کٹ گیا تھا"

"ہاں ہاں"

"تمہیں داؤ دکا کنواں یاد ہے اور وہ بند گلی؟"

"ہاں"

"میرے بابو کو وہیں تو مار ڈالا تھا اتنا بڑا خون کا دھبہ"

اچانک سفید خون سے خالی گول چہرہ اس کے منہ پر ایک غبارے کی طرح پھٹ گیا۔

غبارہ جس میں گندہ، رقیق بدبودار سفید پانی بھرا تھا۔ ایسا پانی جس کی جگہ کوئی چہرہ نہ ہوسکتا تھا۔ پھر وہ سفید پانی ایک نفرت آمیز بے رحم چاقو میں بدل گیا۔ بہت تیز ہوا چلی۔ جھاڑیاں دلدل کے چاروں طرف ایسی بے ترتیبی سے پھیل گئیں جیسے وہ پاگل ہوگئی ہوں۔

چاقو ایک فحش چمک کے ساتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھتا ہے۔

پھر خاص اس کے نرخرے کی طرف۔

اسے گلا کٹنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ تو صرف کالی ندی کے بارش سے بھیگے پل کو دیکھے جارہا ہے جہاں آج نہ جانے کہاں سے اتنے بہت سے کوے آکر بیٹھ گئے ہیں۔

[۶]

نیند کے خلاف

"یہ کس قسم کے خراٹے ہیں؟" اچانک بیوی نے سراسیمہ ہوکر کہا۔

"اسے تو یہ خراٹے آتے ہی ہیں" بڑا بھائی آہستہ سے بولا جو ابھی بارش میں بھیگتا ہوا آیا تھا۔

"نہیں یہ ویسے نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ اس طرح کی آوازیں ہیں جیسے کسی کا نرخرہ کاٹا جاتا ہو" بیوی چلائی۔

اور یہ درست تھا کہ اب اس کے منہ سے باہر آنے والے خراٹے دوسری ہی طرح کے تھے۔ یہ کسی شے کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی زبانی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ساتھ اب منہ بھی پورا بند تھا۔ ہونٹ آپس میں بھیچ گئے تھے۔

پھر یہ خراٹے کہاں سے نکل رہے تھے؟ شاید اس کے پورے جسم سے، جسم کے تمام مساموں سے؟ ہر بار کے خراٹے میں اس کی سانس اٹک جاتی سینہ اور پیٹ اوپر کو اٹھ جاتے جیسے دم نکل رہا ہو مگر چند ہی ثانیے بعد اکھڑتی اور اٹکتی سانس پھر اپنی جگہ واپس آجاتی۔ اس کا سوجا ہوا زخمی ہاتھ متواتر اس انداز میں آگے کو پھیلا ہوا تھا جسے وہ کسی کو کوئی شے سونپ رہا ہو۔ مگر حیران کن امر یہ تھا کہ اس کا چہرہ اپنے تمام عضلات سمیت بالکل پرسکون تھا۔ بھائی نے اس کا ماتھا چھوا اور جلدی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ ماتھا انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ آنگن میں بارش کا پانی بھرتے بھرتے گھٹنوں تک آگیا۔

مگر وہ، وہ تو دراصل گانا گارہا تھا۔ اس کا جسم بیحد فعال ہوگیا تھا، اتنا فعال اور سبک رفتار کہ بستر پر لیٹے لیٹے ہی وہ سب سے دور کہیں گاتا ہوا جارہا تھا۔ کوئی گیت تھا جو لوگوں کو خراٹوں

کی صورت سنائی دیتا تھا وہ اپنی ہی ہوا میں جھومتا ہوا دلدل پر چلا جا رہا تھا جہاں کنول کے پھول اور جڑیں بکھری ہوئی تھیں۔

خدا کے پیغام آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ لکھا گیا لفظ ہی سب کچھ تھا چاہے وہ قلب پر ہی کیوں نہ لکھا جائے یا انسان کے حلق، تالو اور غدود کے درمیان۔ وہ بھی لکھے گئے لفظ کو اپنے قلب، حلق اور تالو میں ثبت کر رہا ہے۔ اس کے سر کے اوپر کبوتر، بادل اور ہوائیں ہیں۔ کبوتر کے پنجے میں لفظ بندھا ہے۔ پانی پانی بادل میں لفظ کا عکس تھا اور ہواؤں میں لفظ کی خوشبو۔ یہ سب بھی اسی جانب جا رہے ہیں جہاں وہ دلدل میں جھومتا گاتا چلا جا رہا ہے۔ دلدل پر اس کے پیروں کے نشان بنتے جاتے تھے۔ یہ ایک چٹھی رساں کے اکیلے قدم تھے۔

اس طرح گیت گاتے گاتے اس نے دیکھا کہ وہ ندی جو امر بیل کی طرح اس کے جسم سے لپٹی ہوئی تھی، وہ قطرہ قطرہ ہو کر اس سے الگ ہو رہی ہے، وہ اب نیچے ایک گہری کھائی میں بہہ رہی تھی، ایک کالی ندی بن کر، پتلی سی، رینگتے ہوئے سانپ کی مانند وہ خوشی خوشی، نشے میں جھومتے ہوئے اس گہری گھاٹی کی طرف جانے والی ڈھلان کی جانب چلا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا کیونکہ وہاں ڈھلان پر، دلدل میں وہ چھوٹی سی سات سال کی بچی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بچی کی آنکھوں میں آنسو تھے، بال بکھر کر ماتھے پر آ گئے تھے، گھٹنوں سے اونچی فراک کیچڑ سے سنی تھی۔

''روشنی، روشنی میں آ گیا۔ تمہارے پاپا کی چٹھی لے کر۔ سال گرہ مبارک ہو'' بچی کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آ گئی اور اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ وہ خوشی سے رو رہی تھی۔

اس نے بچی کے روکھے بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر اپنی وردی کی اندرونی جیب سے وہ کاغذ نکال کر اس کی معصوم مٹھی میں تھما دیا۔

میں نے تمہارے گانے کی آواز دور سے سن لی تھی۔

''میں تمہارے لئے ہی تو گا رہا تھا''

''سچ''؟

''ہاں، آؤ اسی دلدل پر گلاب اگائیں''

اس نے بچی کے ہاتھ میں گلاب کا ایک پھول دیا۔ پھر دونوں نے مل کر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے دلدل میں گلاب بویا۔

''وہاں روشنی ہوگئی''
''اچھا روشنی میں چلتا ہوں''
''فرشتے۔تم کہاں جا رہے ہو؟''
'مجھے ابھی اپنا گیت مکمل کرنا ہے''

ڈھلان پر وہ آگے چلنے لگا۔اس کے پیر یہاں دھنس رہے تھے۔مگر اسے محسوس ہوا جیسے وہ اڑ رہا تھا۔زوال کا راستہ ہی روح کی اڑان تھا۔جب وہ وادی میں نیچے بہنے والی کالی ندی میں گر رہا تھا تو ندی اسے ایک بھیانک بارش کی طرح نظر آئی جو گھاٹی سے آسمان کی طرف بہہ رہی تھی۔ندی ایک سرکش گھوڑی کی طرح کسی طور پر قابو ہی میں نہ آتی تھی۔مگر اب وہ قطعاً نہیں گھبرایا۔پیچھے روشنی کھڑی تھی،اس نے اپنے وجود کو ایک عظیم الشان چھتری کی مانند کھلتا اور پھیلتا پایا جس کے اوپر سے ندی کی شور مچاتی بھیانک موجیں گزر رہی تھیں۔اسے اپنے تمام خط تمام محبت نامے اور پیغام بھیگنے سے بچانے تھے اور وہ کامیاب ہو گیا۔طوفانی ہوائیں اور خوفناک بارش اس کے چھتری جیسے وجود کو صرف پھڑ پھڑانے پر مجبور کر سکی تھیں۔بس!

اس نے اپنا گیت پھر شروع کیا۔

یہ گیت اس ردعمل کا نام تھا جو وہ دنیا اور فطرت کی خوبصورتی کو بھینٹ کر رہا تھا اگرچہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خوبصورتی کی طرف جانے والے راستے خوبصورتی کے بالکل الٹ ہوتے ہیں۔یہ وہ گیت تھا جو سناٹے کی طرف نہیں جا رہا تھا بلکہ سناٹے کے خلاف لڑ رہا تھا۔

وہ اب بھی دلدل پر چل رہا تھا مگر اس کے پیروں کے نشان اب دلدل سے باہر بن رہے تھے۔

تو کتنا طویل،دکھ بھرا راستہ،اس نے کاٹا تھا۔ہوا کے اندر ہوا،بارش کے اندر بارش،لاش کے اندر لاش اور خواب کے اندر خواب کو پار کرتے،گزرتے رہنا ہی اس کا عظیم مقدر تھا۔

یہ ایک اکیلے،اداس بہروپئے کے سونے اور بوجھل پاؤں کے نشان تھے جو غفلت اور نیند کے خلاف ایک نیا بیانیہ گڑھ رہے تھے۔

کیا انسانیت ان نشانوں کے پیچھے چلنے کو تیار تھی؟

مگر اب اسے اس کی کوئی پرواہ نہ تھی،اس کے عقب میں دلدل پر گلزار سج رہے تھے۔

ساری سرنگوں کے دہانے روشن ہوگئے تھے......

''دنیا میں پھول ہی پھول۔ روشنی ہی روشنی۔ گیت ہی گیت۔

صبح کے چار بج رہے تھے جب بارش رکی۔
ڈاکٹر آیا اور اس کا معائنہ کیا۔
''بخار تو اب بہت کم ہے، کل سے اس علاقے میں پھر طاعون کی افواہ اڑ رہی ہے''
ڈاکٹر نے اس کی بغلوں اور جانگھوں کو ٹٹولا۔
''نہیں پلیگ تو نہیں ہے'' ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا، مگر بخار میں بھیگ جانے کے سبب سخت اور جان لیوا نمونیا ہو گیا ہے۔''
اور ایک بات اور...... ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کو کھول کر دیکھتے ہوئے مایوسی سے کہا۔
یہ کوما میں چلے گئے ہیں۔ شاید ایک گھنٹہ پہلے انہیں ایک ہارٹ اٹیک بھی ہو چکا ہے۔''
''کوما''؟ سب نے ڈاکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''ہاں ایک ایسی بے ہوشی یا نیند جس میں مر کر بھی آدمی نہیں مرتا۔ کبھی سال بھر کبھی دو سال اور کبھی کبھی تو بیس سال تک بھی یا اس سے بھی زیادہ۔ کوما میں گئے انسان کے دماغ کے خلیے کچھ اس طرح کام کرتے ہیں کہ وہ خواب ہی دیکھتا رہتا ہے اور خواب بھی زیادہ تر اچھے اور خوبصورت مثلاً پھولوں کے، بچوں کے، وادیوں کے اور روشنی کے''
اس کے بلند خراٹے اسی طرح جاری تھے۔
''یہ کیا بات ہوئی ڈاکٹر۔ یہ تو ایک کتے کی موت مرنا ہوا۔'' اس کی بیوی نے نفرت اور شکایت بھرے انداز میں کہا۔
''ہاں مگر کہا نہیں جا سکتا کہ یہ حالت کب تک رہے گی۔ انسان کبھی کبھی اس طرح بھی لڑتا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔
''کس سے؟'' بڑے بھائی نے پوچھا۔
''پتہ نہیں، شاید موت سے، یا زندگی سے یا پھر کسی اور شئے سے'' ڈاکٹر نے چپکے سے کہا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

✠ ✠ ✠

سجدہ

شہناز خانم عابدی

"کیا ہوا — ؟ کیا کہا عبدالغفور صاحب نے — ؟"

"کس سلسلے میں — ؟"

"کس سلسلے میں — ؟ آپ انجان کیوں بن رہے ہیں۔ آپ نے عبدالغفور صاحب سے قرض ادا کرنے کو کہا ہوگا۔ کیا جواب دیا انہوں نے — ؟"

"میں نے ان سے تقاضا نہیں کیا۔"

"اور وہ چلے بھی گئے۔؟ میں نے یہ سمجھا تھا انہیں ہماری حالت کی خبر ہوگئی ہے اس لئے ہمارا قرض لوٹانے آئے ہیں۔"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا ضرور پیسے دینے آیا ہوگا۔"

"آپ کہہ کر تو دیکھتے۔"

"ارے بھئی' آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ بھول گئیں اللہ میاں سے ہمارا پرانا معاہدہ ہے، وہ ہمیں بغیر مانگے قرض دلوائیں گے اور قرض خواہ کے تقاضے سے قبل قرض ادا کروائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاہدے کی ہمیشہ لاج رکھی، ایک معاملے میں تو تم خود بھی گواہ ہو جب میں حملۂ قلب کا شکار ہوا تھا۔ علاج، معالجے اور ماہران امراض کی فیسوں کی ادائیگی اور چہار جانب سے مہمانوں کی بھرمار نے جیب اور ہاتھ خالی کردئے تھے تو اس مالک نے سبیل پیدا کی۔

دو تین اہل دل آگے آئے اور بغیر مانگے انہوں نے قرض دیا۔ اور تم اس کی بھی گواہ ہو کہ ہر کسی کا قرض اس طرح ادا کیا گیا کہ لینے والا یہ کہتا رہ گیا" پیسے لوٹانے کی اتنی جلدی کیا تھی۔"

" آپ مجھے کیوں یاد دلا رہے ہیں۔؟ مجھے سب کچھ یاد ہے لیکن عبدالغفور صاحب ڈھائی سال سے پیسے لئے بیٹھے ہیں اور وہ بھی پچاس ہزار۔ میل جول بھی ختم کر رکھا ہے، اتنے عرصے کے بعد وہ آئے اور آپ نے ان سے پیسے نہیں مانگے جبکہ آپ جانتے ہیں ہمیں پیسوں کی کتنی سخت ضرورت ہے۔ اس میں آپ کی کیا منطق ہے......؟"

" منطق ہے جب میں نے اپنے مالک سے دعا کی کہ قرض ملے تو تقاضے سے قبل ادا ہو جائے تو میں کسی سے اپنے پیسوں کا تقاضا کیسے کر سکتا ہوں......؟"

" کیوں نہیں کر سکتے آپ نے اللہ تعالیٰ سے کب کہا تھا کہ اپنے دئے ہوئے قرض کا تقاضا نہیں کریں گے۔؟"

" میں نے اللہ تعالیٰ سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا لیکن مجھ پر لازم آتا ہے کہ میں بھی اپنے قرض کا تقاضا نہ کروں اور اپنے مالک کے ایک بندے کی شرم رکھوں۔ جیسے مالک میری شرم رکھتے رہے ہیں۔"

" میں آپ کو کیسے بتاؤں یہ بک بک جھک جھک کیوں کر رہی ہوں......؟ پہلا روزہ ہے، سحری کے وقت اتنا ہو سکا کہ ابا جی کے لئے تھوڑا سا دلیہ پیش کر دیا۔ آپ کے اور حماد بیٹے کے لئے کچھ نہ کر سکی، بچوں کے لئے ابھی ابھی تھوڑے چنے ابال لئے ہیں۔ افطار کے لئے پریشان ہوں۔ کاش! آپ عبدالغفور صاحب سے پورے نہیں تو تھوڑے سے پیسے مانگ لیتے۔"

اس مکالمے کے بعد اس کی بیوی زینب اٹھ کر چلی گئی انتہائی تنگدستی کے اس مرحلے پر ادائیگی قرض کا تقاضا نہ کرنے کو وہ بے جا ضد پر محمول کرنے پر مجبور تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے زینب کے اس روپ کو دیکھا تھا۔ اس روپ کو تو مردوں نے اپنے لئے مختص کر رکھا ہے...... اہل خانہ کی کفالت کرنے والا روپ...... جب سے وہ اور اس کا بیٹا حماد بے روزگار ہوئے تھے زینب اس طرح پریشان پھرتی تھی جیسے وہ اپنے کسی قرض کی ادائیگی میں ناکام ہو رہی ہے۔ جیسے گھر بھر کا پیٹ بھرنا اس کی اور صرف اس ہی کی ذمہ داری ہو۔ اس کا بس چلتا تو باہر نکل کر مزدوری کرنے لگتی۔ ہاشم! اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ شاید وہ اس کی ہٹ دھرمی سے بد دل ہو کر گئی تھی۔ ایک وقت تھا وہ اور مردوں کو خواہ بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں زینب کی طرف دیکھتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھی ہی غضب کی خوبصورت۔" اب کہاں زینب اور کہاں وہ ——

دونوں جیسے جیتے جی گزر گئے...... اور موجودہ مالی پریشانی۔ ہاشم کو سوچوں نے گھیرا ہوا تھا۔
اس کی بے کاری کے ساتھ لڑکا بھی بے روزگار ہو...... اور اس طرح جیسے دونوں پر کسی نے روزگار کے دروازے بند کر دیئے ہوں.........

کچھ مہینے گھر کی مختلف اشیاء بیچ کر گھر چلایا گیا...... پھر زیور بکا...... اور یہاں تک کہ زینب کے قیمتی ملبوسات بھی اونے پونے نکال دیئے گئے۔ گلی، محلے اور نزدیک اور دور کے رشتہ داروں سے ان کی حالت چھپی نہ تھی لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ الٹا اکثر نے ترک تعلق کر لیا۔ لوگ باگ، باہر بھی سامنا ہو تو آنکھیں ملائے بغیر راستہ کاٹنے لگے۔ ہر روز وہ دونوں باپ بیٹے باہر نکل جاتے اور ہر طرف بند دروازوں سے ٹکرا کر واپس آ جاتے۔

ان حالات میں عبدالغفور کا آنا اور ادھر ادھر کی گپ شپ کر کے چلا جانا اسے بھی بہت کھلا۔
اس نے سوچا، وہ نہیں آتا تو اچھا تھا......

وہ اس کا دوست رہا تھا۔ اب وہ اسے دوست نہیں کہہ سکتا تھا......

کس منہ سے کہتا......؟

"مالک کچھ کیجئے۔ میری خطاؤں سے چشم پوشی فرماتے ہوئے ہم سب پر رحم کیجئے۔" اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی اور بے اختیار رو پڑا......

عین اس مرحلے پر اس کا بیٹا حماد آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لمبا چہرہ جو حالات کے زیر اثر لٹک کر اور لمبا ہو گیا تھا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ چھوٹی آنکھیں اندر کی طرف دھنس رہی تھیں۔ گال پچک کر چہرے پر صرف ناک ہی ناک رہ گئی تھی۔ بیٹا اسے کچھ دیر دیکھتا رہا پھر چپ چاپ لوٹ گیا۔ صاف ظاہر تھا جو کچھ وہ کہنے آیا تھا کہہ نہ سکا...... بیٹے کے پیچھے وہ خود اندر گیا۔ زینب بچوں کو گھگنیاں کھلا رہی تھی اور اس کے فائدے سمجھا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر چونکی اور سوالیہ نظر ڈالی...... زینب کی آنکھیں اب بھی ستاروں کی طرح تھیں۔

"حماد آیا تھا اور بغیر کچھ کہے لوٹ گیا۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا......؟"

ہاشم نے زینب کی آنکھوں میں اپنا جواب تلاش کرتے ہوئے کہا:

"اس نے آپ سے کچھ نہیں کہا......؟ میں نے اسے بتایا تھا آپ عبدالغفور صاحب سے پیسوں کا مطالبہ نہیں کریں گے کیونکہ آپ تقاضا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ آپ بے شک نہ مانگیں لیکن ایک پرچہ لکھ دیں وہ عبدالغفور صاحب کو دے آئے گا" زینب نے کہا۔

ہاشم نے زینب کو آنکھ بھر دیکھا، اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا، جیسے پسینہ پونچھ رہا ہوں اور قریب قریب روتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد اس نے حماد کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ حماد کے پیچھے وہ بھی گھر سے باہر نکل گیا اور جہاں جہاں بھی ملازمت ملنے کا شائبہ نظر آیا وہاں دستک دی اور تھک ہار کر گھر لوٹ آیا۔

سہ پہر کا وقت تھا گھر کے سب مکین موجود تھے، حماد بھی گھر لوٹ آیا تھا۔ ابا جی بھی موجود تھے۔ بچے بھی تھے، زینب بھی تھی۔ لیکن گھر میں خاموشی تھی۔ مایوسی تھی اور گھر آباد ہو کر بھی غیر آباد لگتا تھا یا اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے آپ سے بہت بک بک جھک جھک کی۔ "کیا مجھے عبدالغفور کے گھر جا کر پیسوں کا تقاضا کرنا چاہیے یا نہیں......"

وہ خود بھوکا رہ سکتا تھا، مزید صبر کر سکتا تھا، اپنے اصولوں پر ڈٹا رہ سکتا تھا اور اسے ایسا کرنا ہی چاہئے تھا لیکن گھر کے دوسرے لوگ ضعیف العمر والد اور چھوٹے بچے، ان کا کیا ہوگا......" اور زینب نے جو اس کی منطق پر طعنہ زنی کی تھی، وہ غلط بھی تو نہیں تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نے کسی کو قرض خواہ کے ہاتھوں بے عزت ہوتے دیکھا تھا...... برسوں پہلے ان دنوں وہ ایک لڑکا ہی تو تھا یا شاید نوجوان۔ اس کے دل پر اس کا اثر ہوا تھا اور رات سوتے وقت اس نے بستر میں لیٹے لیٹے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے اور کہا تھا:

"مالک میرے اگر مجھ کو کبھی قرض لینے کی نوبت آ جائے تو مجھے بغیر مانگے دلوانا اور قرض خواہ کے طلب کرنے سے پہلے اس کا قرض ادا بھی کروا دینا۔"

اس دعا کے مانگتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہ منظر آ گیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا قرض دار ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اور قرض خواہ اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ لوگ باگ آنکھیں نیچے کئے گزر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے لڑکے یہ سب دیکھ رہے تھے اور گلی کے دو چار اوباش کھڑے ہنس رہے تھے۔

اس نے اس حالت میں اپنی یہ عجیب سی دعا کئی مرتبہ دہرائی۔ شاید رویا بھی اور دعا مانگتے مانگتے سو گیا۔

وہ اس دعا کو اور اس دعا کے محرک کو بالکل بھول جاتا لیکن زندگی نے لگاتار ایسے مواقع پیدا کئے کہ دعا کے قبول ہونے کے شواہد سامنے آتے گئے اور اس کا اعتقاد یا ایمان پختہ ہوتا چلا گیا لیکن اس وقت وہ ایسی صورت حال سے دوچار تھا جو اس سے قبل کبھی پیش نہیں آئی تھی۔ اس وقت وہ قرض خواہ تھا اور اس کا دوست عبدالغفور قرضدار۔ صورتحال بیحد گمبھیر تھی، وہ بیحد

ضرورتمند تھا اور عبدالغفور کی مالی حالت خاصی بہتر تھی۔

"اسے تو یوں بھی میری مالی اعانت کرنی چاہئے تھی نہ کہ مجھ کو واجب الادا رقم لوٹانے میں بغیر کسی سبب کے تاخیر۔ عبدالغفور کا رویہ نا قابل فہم تھا لیکن اس کا معاملہ وہی سمجھ سکتا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں اپنی رقم کا اس سے تقاضا کرتا...... تو کیا میں اس سے مانگوں......؟"

اس کو سوچوں نے گھیرا ہوا تھا — اس کے ایسے ہر سوال کا جواب "نفی" میں مل رہا تھا۔ اس کے اندر کا "میں" برابر منع کئے جا رہا تھا۔

ایک طویل وقفہ اسی طرح گزرا...... پھر گھر کے اندر سے کچھ آوازیں آئیں جیسے کوئی زینب سے باتیں کر رہا ہو۔ شاید پردہ دار خواتین آئی تھیں جو کچھ دیر ٹھہر کر چلی گئیں۔ وہ جہاں لیٹا تھا، لیٹا رہا البتہ اس کو تجسس ہو رہا تھا کہ یہ کون عورتیں تھیں جو اس کے گھر آئی تھیں......

عورتوں نے تو کیا مردوں نے بھی اس کے گھر آنا جانا کبھی کا بند کیا ہوا تھا۔

"تو پھر یہ کون ہو سکتی تھیں......؟" اس نے سوچا۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں نے زینب کے قدموں کی چاپ سنی۔ اس چاپ کا اس کے دل کا دھڑکنوں سے قدیمی رشتہ تھا...... نہ ٹوٹنے والا رشتہ۔ پھر اس نے زینب کی چمکتی آنکھیں دیکھیں...... زینب اپنی پرانی حسین چال سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہاشم نے اسے اس طرح آنکھوں میں بھر لیا جیسے پچھلے وقتوں میں بھر لیا کرتا تھا......

"بھابھی اپنی بیٹی کے ساتھ آئی تھیں" وہ بولی۔

"کون بھابھی......" ہاشم نے تعجب سے پوچھا۔

"عبدالغفور بھائی کی بیگم" زینب نے خوشگوار لہجے میں کہا مگر اسے طنز لگا۔

"صبح عبدالغفور اور اس وقت ان کی بیگم اور بیٹی...... خیر تو ہے" وہ بولا۔

"افطاری لائی تھیں" زینب بولی۔

"ارے واہ! اتنے عرصے کے بعد تشریف لائیں وہ بھی افطاری کے ساتھ"

اس کا کیا مطلب......؟" وہ تعجب سے بولا۔

"اس کا مطلب تو آپ جانیں، یہ لیجئے عبدالغفور صاحب نے یہ لفافہ آپ کے لئے دیا ہے۔" یہ کہہ کر زینب نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ہاشم نے حیرانی سے لفافہ لیا اور اسے چاک کیا تو اس میں نوٹ بھرے تھے...... پورے پچاس ہزار کی رقم اور ساتھ میں چھوٹا سا پرچہ جس پر لکھا تھا:

''تاخیر کے لئے بہت بہت معذرت خواہ ہوں''

تمہارا

عبدالغفور

ہاشم ایک جھٹکے سے چارپائی سے نیچے اترا...... پچاس ہزار کے نوٹ فرش پر بکھر گئے......وہ، زینب اور فرش پر ادھر ادھر گرے ہوئے نوٹوں سے بے پرواہ کمرے کے کونے میں تپائی پر رکھے ہوئے مصلے کو بچھا کر قبلہ رو سجدے میں گر پڑا تھا۔

✠ ✠ ✠

ایسا کیوں؟

شکیلہ رفیق

پچھلے کچھ دنوں سے میرے گھر والے مجھے ہندوازم سے متاثر سمجھنے لگے ہیں۔ کیوں کہ مجھے اس دور کی باتیں بھی یاد آرہی ہیں جب انسان کا پورا ذہن بنا بھی نہیں تھا۔ جب بھی میں اس دور کی کوئی بات کرتی ہوں، جانے کیوں بجیا ایک دم چیخ پڑتی ہیں۔

''اور لگاؤ لا کر Dish گھر میں، دیکھیں بیٹھ کے انڈین ڈرامے — اور — یقین کرنے لگیں دوسرے جنم پر — وہ بھی اس عمر میں —''

جب کہ ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں — یہ بات میں بجیا کو کیسے سمجھاؤں کہ نہ تو مجھے دوسرے جنم پر یقین ہے، نہ ہی ڈش نے مجھے بے راہ رو کیا ہے۔ اور اب تو اس دھرم کے پڑھے لکھے خود بھی دوسرے جنم کو نہیں مانتے — مجھے تو — آپ ہی آپ اپنا ماضی یاد آئے چلا جارہا ہے۔ اپنا بچپن، اپنا لڑکپن، حتیٰ کہ وہ دور بھی جب میں اماں کے پیٹ میں ٹانگیں سکیڑے اس منی سی دنیا سے اپنی ماں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کیا کرتی تھی، کتنے پیار اور ہمت سے میرا بوجھ اٹھائے پھرتی تھیں۔

اور — کمال ہے! وہ دن بھی یاد آرہا ہے، جب میں اس دنیا میں آئی، پلکیں پٹ پٹا کر اپنی ماں کو دیکھا......

تو وہ —

مجھے اپنے سے بھی زیادہ معصوم نظر آئی...... بھولی بھالی شکل اور خوبصورت شربتی آنکھیں...... جن پر آنکھوں سے پینے کا محاورہ پورا اترتا تھا۔ پہلی بار جب میں ماں کی چھاتی سے لگی تب اس سے نکلتی دودھ کی گرم گرم دھاریں میرے ننھے سے وجود کو لطف اور حرارت کے ساتھ قوت بھی بخشنے لگیں۔

پھر —

چھ ماہ بعد ہی میں ایک گول مٹول سی بچی میں تبدیل ہوگئی، جو نہ صرف بیٹھنے لگی تھی بلکہ بستر پر بیٹھے بیٹھے اپنی بھوری بھوری آنکھیں چاروں جانب نچایا کرتی — گھر کے اتنے سارے افراد میں سے اسے اپنی ماں ہی اچھی لگتی تھی، شاید اس لئے کہ میں اس کی نیندیں جو خراب کیا کرتی...... کہ...... اکثر میں آدھی رات کو بھی جب کہ وہ گہری نیند میں ہوتی تھی، اس کا جمپر ٹٹولنے لگتی تھی۔ پھر بھی وہ مجھے سینے سے لگائے رکھتی۔

مجھے اپنا وہ دور بھی یاد ہے جب میں نے پہلا قدم اٹھایا — اور — تعجب ہے کہ گری نہیں...... مگر محتاط ضرور ہوگئی اور دوسرا قدم نہیں اٹھایا — بس آنکھیں جھپک کر ماں کو دیکھا — مجھے اتنا محتاط پا کر ماں اگلے روز ہی میرے لئے ایک چار پہیوں والی گاڑی لے آئی — جسے سب walker کہہ رہے تھے۔ پھر مجھے اس کے ذریعہ چلنے کی تربیت دی جانے لگی —

وہ دن —

مجھے بڑے سنہرے لگ رہے تھے۔ میں کسی کی محتاجی کے بغیر، اس واکر کے ساتھ سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھی۔ بنا ڈر وخوف...... جہاں چاہتی چلی جاتی۔ جو چیز چاہتی جا کر اٹھا لیتی۔ بہت ہی مزے دار تجربہ تھا —

اور —

بات ساری یہ ہے کہ ان دنوں مجھے اپنا وہ دور ہی سب سے زیادہ یاد آرہا ہے اور — جب جب بھی میں اس دور کی بات یاد کرتی ہوں، یہ سب مجھے شکوک کی نگاہوں سے گھورنے لگتے ہیں اور کوئی بھی میری بات نہیں سمجھتا، اماں ہوتیں تو سمجھ جاتیں...... مگر...... وہ اب اس دنیا میں کہاں...... خصوصاً بجیا تو بنا سانس لئے شروع ہوجاتی ہیں۔

''اے میں کہتی ہوں...... کسی بچے کو بھلا سال ڈیڑھ سال کی عمر کی باتیں یاد رہتی ہیں؟ کہے جا رہی ہوں ان کو جا کر ماہر نفسیات کو دکھاؤ...... مگر کوئی میری سنے جب نا!''

"ارے امی! زیادہ عمر ہو جاتی ہے تو انسان اکثر ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ میرا بھانجا بدر اپنی ماں یعنی بجیا کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔

"ارے بھیا سٹھیاتے تو بہت لوگ ہیں...... مگر...... یہ تو مجھے دماغی مسئلہ لگتا ہے...... وہ، وہ باتیں بتاتی ہیں جو مجھے، اس سے بڑی ہونے کے باوجود یاد نہیں۔"

بدر بولا — "اچھا اب ان دنوں چونکہ وہ بیمار بھی ہیں اس لئے ان کو ignore کرنا ہی بہتر ہوگا امی!"

اس کے باوجود بجیا اکثر میرا test لینے آجاتی ہیں۔ میرے پاس بیٹھ کر وہ پوچھتی ہیں۔

اچھا بتاؤ...... جب تم دو سال تین مہینے کی تھیں، تب کیا کیا تھا؟"

"تب؟"

"ہاں تب...... تمہیں تو اس وقت کا سب کچھ یاد آ رہا ہے نا؟"

"اوں......" میں سوچنے لگتی ہوں۔

"بولو، بولو......"

"ہاں آں!...... وہ potty training کے باوجود جانگیہ میں کر دیا تھا۔" میں ہنسی تو ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"کیا؟ کیسے یاد ہے یہ تمہیں؟"

"بس...... یاد ہے"

سچ تو یہ تھا کہ محض اندازہ تھا۔ جانتی جو تھی کہ بچے کبھی کبھار ایسا کر دیتے ہیں۔

مگر —

بجیا نے تو اس کے بعد کچھ بھی نہ پوچھا۔ دانتوں میں انگلی دبائے مبہوت سی اٹھ کر چلی گئیں — پھر — اس کے انہوں نے مجھ سے بہت دنوں تک کچھ بھی نہ پوچھا۔ نہ ہی کسی اور سے میرے بارے میں کوئی بات کرتی نظر آئیں — اور — انہوں نے چینخنا اور تبصرہ کرنا بھی بند کر دیا تھا۔

میں ایک جانب سے مطمئن سی بھی ہو گئی — مگر — دوسری جانب فکر مند بھی تھی کہ بجیا، کہیں مجھے پاگل تو نہیں سمجھ رہیں، اور انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے — اکیلی بجیا ہی کیا، باقی سب بھی مجھ سے خصوصی برتاؤ کر رہے ہیں۔ شاید میرا دل نہ دکھے۔ اس خیال سے کھلم کھلا کوئی اظہار نہیں کر رہے —

مگر —

میں جانتی ہوں کہ سب میرے لئے فکر مند ہیں اور مشکوک تو سب ہی ہیں اب — میں انہیں سمجھا بھی تو نہیں سکتی...... کہ...... میں ان دنوں کیا کیا سوچ رہی ہوں۔ اس بھنور بیچ کیوں پھنسی ہوں؟ یہ سب کے سب جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ دیکھتے ہیں — مگر — جو نہیں نظر آ رہا ہے اس کی کھوج کوئی نہیں لگا رہا کہ...... ایسا کیوں ہے؟

ابھی گزشتہ ہفتے ہی سے تو میں نے یہ باتیں شروع کی ہیں، جب — گھٹنوں کے آپریشن کے بعد، بدر میرے لئے واکر لایا ہے بس...... تب سے ہی مجھے اپنا وہ سنہری دور یاد آئے چلا جا رہا ہے...... جب ماں — پہلی بار میرے لئے واکر لائی تھی — اور میں — ! کیسا اس کے ساتھ بنا ڈر وخوف سارے گھر میں بھاگتی پھرتی تھی — جیسے اب تو مجھے کسی کی مدد یا سہارے کی ضرورت نہ ہو۔

اب —

وہی دور پھر واپس آ گیا ہے —

مگر —

وہ دور تو مجھے اپنی زندگی کا سنہری دور محسوس ہوتا تھا۔

اور اب —

اس میں ڈر وخوف کیوں در آیا ہے؟؟

✠ ✠ ✠

روشنی کے لئے

سید احمد قادری

قتل کا منصوبہ طئے ہو گیا۔

لال ہرے نوٹوں سے بھرا بریف کیس، ایک تصویر اور ساتھ میں نام و پتہ آنے والے شخص نے پیشہ ور قاتل جابر بھائی کے حوالے کیا، جابر نے تصویر دیکھی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''ارے یہ تو بالکل فاختہ کی اولاد معلوم ہوتا ہے، اس کی آنکھوں میں عیاری ہے، نہ مکاری ہے، چہرے پر بھی معصومیت ہے، ایسے بے ضرر آدمی کو کیوں مروار ہے ہو؟

جابر کے اس سوال پر سامنے کھڑا بریف کیس دینے والا لحیم شحیم شخص، جس کی آنکھوں اور چہرے سے درندگی جھانک رہی تھی، طیش میں آ گیا اور غصہ بھرے لہجہ میں کہا——

''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے، تم روپئے لو اور کام کرو فالتو بک بک نہیں۔''

''ارے یار تم تو خفا ہو گئے، میں تو یونہیں پوچھ رہا تھا۔ مجھے اس شخص سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، تم تو کسی مرغی کو بھی مارنے کے لئے پیسے دو گے تو میں تیار رہوں گا۔ مجھے تو بس پیسے سے مطلب ہے۔ پیسہ...... ہاہاہا...... پیسہ...... پیسہ ہی تو آج سب کچھ ہے، پیسے سے جو چاہو خرید لو، ایمان، دھرم، آرام، عیش اور یہاں تک کہ بڑی سے بڑی کرسی بھی —— ہاہاہا—— فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے جابر آنے والے سرخ مائل چہرہ والے شخص کو دیکھنے لگا۔

جابر کے اس قہقہہ کو نظر انداز کرتا ہوا سرخ اور کرخت چہرہ والا شخص بولا——

تمہاری مانگ پوری کر دی گئی ہے، تم کام پورا کرو اور کام ہونے کے بقیہ پانچ لاکھ تمہیں مل

جائیں گے۔ ویسے تم نے پوچھا ہے تو سنو۔ یہ سالا، بہت ایماندار بنتا ہے، ہمارے ڈیل میں اڑنگا لگا رہا ہے، اس ایک شخص کی وجہ سے میرے باس کے ماتحت چلنے والی بیس پچیس کمپنیوں کو تجارتی فائدہ ہونے والا ہے، وہ رک جائے گا، اس سالے کو پہلے خریدنے کی کوشش کی گئی، کروڑوں روپے کا آفر دیا گیا، پھر بھی راضی نہیں ہوا، پھر ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی گئیں لیکن یہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ...... اور اب آخر میں اس کا خاتمہ ہی اس کا علاج ہے......"

"خیر، چھوڑو، ان باتوں کو تم جتنا جلد ہو، اس کا کام تمام کرو، اور بقیہ روپے لے لو۔" یہ کہتا ہوا، سرخ اور کرخت چہرہ والا شخص، جو بہترین سوٹ میں ملبوس تھا، واپسی کے لئے مڑ گیا۔

اس شخص کے جاتے ہی جابر نے اپنے ایک خاص آدمی بھیما کو آواز دی اور وہ جب قریب آیا، تو جابر نے اس کے ہاتھوں میں وہ تصویر اور پتہ دیا اور کہا ـــــ

"جاؤ پتہ لگاؤ، یہ آدمی کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، گھر آنے جانے کے لئے کون سا وقت اور راستہ اپناتا ہے، اس کا ٹکٹ کچا ہے، جلد سے جلد اوپر بھیجنا ہے، ہاہاہا...... بات سمجھ گیا نا......"

یہ کہہ کر بھائی نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ایک سگریٹ سلگا کر فضا میں مرغولے چھوڑتے ہوئے، سامنے ٹیبل پر رکھی شراب کی بوتل سے اپنا منہ لگا دیا۔

تیسرے دن ہی بھیما، ہاتھ جوڑے بھائی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا "ہاں بھائی، سب کچھ پتہ لگا لیا ہے۔ لیکن بھائی، وہ آدمی تو بالکل مرا ٹوٹا ہے، اسے مارنے کیلئے خواہ مخواہ......"

"ابے سالے، تجھے بھی اس سے ہمدردی ہو گئی، مرے ٹوٹے، ایماندار، شریف آدمی ہی تو آج کے دور میں خطرناک ہوتے ہیں، ایسے لوگ نہ خود ترقی کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو ترقی کرنے دیتے ہیں۔ اب دیکھئے اس ایماندار آدمی کو ہم پیسے لے کر ماریں گے نہیں، تو کھائیں گے کیا...... ہاہاہا...... ہاہاہا ...... بھائی نے ایک زبردست قہقہہ لگایا...... بھیما بھی ہنسنے لگا۔

"ہاں بھائی، یہ تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو، ہم لوگ کیا جھال بجائیں گے، ہی ہی ہی......"

"اچھا سن ـــ" بھائی اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بھیما سے پھر مخاطب ہوا اور پوچھا کل یہ کام ہو جائے گا؟

"ہاں بھائی، بڑے آرام سے ہو جائے گا۔ وہ آدمی ہر روز اپنے دفتر سے لوٹتے ہوئے اپنے پارٹی دفتر جاتا ہے اور نو دس بجے رات تک اپنے گھر لوٹتا ہے' خالی ہاتھ، نہ کار، نہ اسکوٹر، نہ سائیکل اور نہ ہی کوئی سیکوریٹی......"

"ٹھیک ہے تو کل ہی یہ کام کر دیا جائے، مرے ہوئے کو مارنے میں دیر نہیں کرنا چاہئے"

کیوں، ہے نا، ہاہاہا......"

بھائی نے حسب عادت پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھیما سے کہا۔

"ٹھیک ہے، تو، اب جا اور کل رات آٹھ بجے تک آ جانا"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر شراب کے گھونٹ لینے لگا۔

دوسرے روز بھیما وقت پر آ گیا!

اس وقت چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا شام سے لائٹ گل تھی، بس کسی کسی گھر سے روشنی کی کرنیں جھانک رہی تھیں۔

بھیما کو دیکھتے ہی، جابر جو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا، اٹھ کھڑا ہوا اور بھیما سے بولا— "چل"

دونوں کمرے سے باہر نکلے، پورٹیکو میں کھڑی لمبی، چمچماتی ایک خاص کار میں دونوں سوار ہوئے، بھیما نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جابر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کار نے اس شخص کے گھر کے اطراف کا ایک چکر لگایا، پھر پارٹی آفس کے دو راؤنڈ لگائے اور پھر ایک سنسان جگہ پر ایک درخت کے نیچے کار کھڑی ہوگئی۔ بھائی نے ایک سگریٹ سلگائی اور وہاں پر کی پر بہار فضا کو سگریٹ کے دھوئیں سے آلودکرنے لگا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے دو شخص سامنے سے آتے ہوئے دکھے۔ دونوں ہی ادھیڑ عمر کے تھے، ایک کی آنکھوں پر عینک تھی، سادہ کرتا، پائجامہ اور پاؤں میں اس کے چپل تھی اور وہ شخص بڑے جوش بھرے لہجے میں اپنے دوست سے باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، بھیما نے عینک والے شخص کی طرف اشارہ کیا، جابر نے بھی تصویر والے شخص کو آسانی سے گاڑی کی تیز روشنی میں پہچان لیا، دونوں شخص مخالف سمت سے بڑے اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے چلے آرہے تھے اور جیسے ہی دونوں کار کے قریب پہنچے، جابر کے سائلنسر لگے ریوالور سے بڑے نپے تلے انداز میں دو فائر ہوئے، ایک دلدوز چیخ ابھری اور گاڑی جو پہلے ہی سے اسٹارٹ تھی، زن سے آگے بڑھ گئی۔ بھائی نے بڑے اطمینان سے پھر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں پر رکھ کر جلائی اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

صبح ہوئی اور بھائی یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھا کہ رات مارے گئے نرنجن کمار کے قتل پر سارے

اخبارات اور ٹیلی ویژن کے نیوز چینل چیخ پڑے تھے۔ شردھانجلی دی جارہی تھی، قتل کی مذمت کی جارہی تھی اور طرح طرح کی وجوہات سے اس قتل کو جوڑا جارہا تھا۔

یہ سب دیکھ کر بھائی سوچنے لگا، قتل کرانے والا شخص تو کہہ رہا تھا کہ یہ معمولی سا آدمی ہے، شریف اور ایماندار ہے، ڈیل میں رخنہ ڈال رہا ہے، اس لئے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہے، پھر ایسے معمولی شخص کے قتل پر اتنا ہنگامہ کیوں ہے؟

بھائی کو حیرت ضروری ہوئی لیکن اس نے اخبارات اور نیوز چینل کی خبروں پر دھیان نہیں دیا اور سوچا، یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے، آج کل نیوز چینل اور اخبار والوں کو بس خبر چاہئے، بات کا بتنگڑ بنانا ان کی عادت ہے۔

اسی روز رات گئے پھر وہی سرخ رنگت اور کرخت چہرہ والا شخص آیا اور اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے، بھائی کے سامنے بقیہ روپئے سے بھرا ایک بیگ اس کے حوالے کیا۔

روپئے سے بھرے بیگ کو لیتے ہوئے، بھائی نے اس شخص سے پوچھا۔ ''اس آدمی کے مرنے پر یہ اخبار اور ٹی وی والے تو بڑا ہنگامہ کر رہے ہیں۔''

''ارے کچھ نہیں، چند روز میں سب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔'' یہ کہتا ہوا وہ شخص واپسی کے لئے مڑ گیا۔

لیکن نرنجن کمار کے قتل کا معاملہ طول پکڑتا جارہا ہے، ہر روز اخباروں اور نیوز چینلوں پر ہنگامہ تھا، مذمت کا سلسلہ جاری تھا اور اس قتل کی تفتیش کسی بڑی جانچ ایجنسی سے کرانے کا مطالبہ بڑھ رہا تھا۔

بھائی کو تھوڑی تشویش ہونے لگی، وہ بار بار سوچ رہا تھا اتنے لو پروفائل آدمی کے قتل پر اتنا ہنگامہ کیوں برپا ہو رہا ہے؟

''چلو، اس نرنجن کے گھر چلتے ہیں، دیکھیں، آخر اس آدمی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ اتنا ہنگامہ ہے۔''

بھیما بھائی کی اس خواہش پر ششدر رہ گیا، بھائی کو یہ کیا سوجھی، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بھائی نے کوئی فیصلہ کرلیا، تو وہ فیصلہ اٹل ہے۔

بھائی نے کہا-- ارے تو اتنا گھبرا کیوں رہا ہے، چل، ذرا دیکھا جائے۔ یہ آدمی اتنا شریف اور ایماندار تھا، تو پھر اس کے قتل کے لئے دس لاکھ روپئے کیوں خرچ کئے گئے۔

بھیما، بھائی کی بات سن کر خاموش ہی رہا، اور بے دلی سے اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

باہر نکل کر دونوں ایک چھوٹی گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی نرنجن کمار کے گھر کی جانب چل پڑی۔

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی نرنجن کے گھر کے قریب رکی، بھائی دیر تک گاڑی میں خاموش بیٹھا، سگریٹ پھونکتا رہا۔

اس وقت وہ ایک عجیب تذبذب اور کشمکش میں مبتلا تھا، اس کے دماغ میں ہلچل تھی، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

کئی سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ گاڑی سے اترا اور بھیما کو گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت دیتا ہوا آگے بڑھ گیا، چند قدم کا فاصلہ طئے کرنے کے بعد وہ نرجن کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

نرنجن کا گھر ایک اوسط درجے سے بھی نیچے کا گھر تھا، ایسا لگتا تھا، اس کے گھر میں برسہا برس سے رنگائی پتائی بھی نہیں ہوئی تھی، کھڑکی دروازے سب جواب دے چکے تھے، گھر کے باہر ویرانی سی چھائی ہوئی تھی، اس نے ہمت کرتے ہوئے صدر دروازے پر دستک دی، جواب میں جلد ہی دروازہ کھلا، سامنے اداس، بے جان سا چودہ، پندرہ سال کا لڑکا کھڑا تھا، اس کے لباس اور رنگ ڈھنگ سے مفلوک الحالی ٹپک رہی تھی۔ لڑکے نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا—

"میں نرنجن جی کا دوست ہوں، خبر ملی تو ملنے چلا آیا۔" بھائی نے بڑی ملائمیت سے کہا۔

"اوہ، اچھا اندر آیئے"— اور لڑکا اسے لئے ہوئے ایک کمرہ میں آگیا، ایک کھڑکی سے ہلکی روشنی آرہی تھی، کمرے کے اندر کئی پرانی اور زنگ آلود کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، درمیان میں ایک ٹیبل بھی تھا، جو اپنی رنگت کھو چکا تھا۔

لڑکا، بھائی کو کمرے میں بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کمرے میں سفید ساری میں لپٹی ایک معمولی شکل وصورت کی عورت اندر داخل ہوئی، جس کی گود میں تقریباً چھ ماہ کا لاغر اور مریل سا بچہ تھا۔ ان دونوں کو بھی دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کبھی اچھی غذا تک نصیب نہیں ہوئی ہے۔

اس عورت کو دیکھتے ہی بھائی کھڑا ہو گیا— عورت کی آنکھوں سے اجنبیت جھانک رہی تھی، جسے سمجھتے ہی بھائی نے ایک سفید جھوٹ کا سہارا لیا اور کہا—

"میں نرنجن جی کا دوست ہوں، باہر رہتا ہوں، حادثہ کی خبر ملی تو ملنے چلا آیا۔"

عورت بھائی کی بات سن کر خاموش رہی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بھائی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت کی گود کا بچہ بار بار اپنی ماں کی چھاتی کی طرف لپک رہا تھا، اور عورت ہر بار اسے اس حرکت

سے باز رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

چند لمحے، عورت اور بھائی آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے، پھر بھائی نے ہی سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

" یہ سب کیسے ہوگیا — ؟

عورت چند ساعت خاموش رہی، پھر گویا ہوئی۔

" یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا، کچھ لوگ اپنے مفاد میں پورے علاقہ کو منور کرنا چاہتے تھے، نرنجن جی کا کہنا تھا کہ اپنی محنت، کوشش اور لگن سے علاقہ کو منور کیا جائے، ایسا مانگے کا اجالا کیا کہ اپنا سب کچھ ختم ہو جائے اور پورے علاقہ کو گروی رکھ دیا جائے۔

عورت کی یہ بات سن کر، اچانک بھائی کو اس سرخ مائل شخص کی بات یاد آئی کہ " میرے باس کے ماتحت بیس پچیس کمپنیوں کا فائدہ ختم ہو جائے گا اگر یہ شخص سامنے سے نہیں ہٹا تو — "

بھائی عورت کی بات سن کر کچھ سمجھ نہیں سکا اور خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا اور بے خیالی میں اس کا ایک ہاتھ پینٹ کی ایک جیب میں چلا گیا، جہاں پانچ سو روپے کی ایک گڈی پڑی تھی۔ اس نے اسے نکال لیا اور عورت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا —

" اسے رکھ لیجئے کچھ کام آئیں گے۔ "

عورت نے بڑھے ہوئے ہاتھ میں روپے کی گڈی کو بے توجہی سے دیکھا اور کہا —

" نہیں بھائی صاحب، اس کی ضرورت نہیں، آپ کے دئے ہوئے یہ روپے میرے کتنے دن کام آئیں گے؟ بھگوان نے مجھے دو ہاتھ اور دماغ دیا ہے، مجھے ان پر زیادہ بھروسہ ہے، اور پھر...... "

عورت کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک وہ لڑکا جو بھائی کو اندر کمرے تک لایا تھا، داخل ہوا، اسے کمرہ کے اندر کم روشنی کا احساس ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں، اور کھڑکیاں کھلتے ہی پورے کمرہ میں اجالا پھیل گیا۔

بھائی، کمرہ سے باہر نکل آیا اور دھیرے دھیرے بے جان قدموں سے وہ آگے بڑھنے لگا، اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں اس وقت سیلاب امڑ آیا تھا۔

✠ ✠ ✠

موت کا کنواں

اسلم جمشید پوری

نوچندی میلے کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔نوچندی میدان میں دکانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ روزانہ بڑے بڑے ٹرک آتے۔ڈھیر سارا سامان اتارتے اور میلے کے شوقین لوگوں کی امید ہوا دیتے چلے جاتے۔کاریگر جوڑ توڑ میں مصروف تھے، دیکھتے ہی دیکھتے نوچندی میدان میں آسمان سے باتیں کرنے والے کئی بجلی جھولے کھڑے ہو چکے تھے جن کا دائرہ اتنا بڑا تھا کہ اوپر دیکھنے کے لئے گردن کو پیچھے تک لے جانا پڑتا تھا۔ کشتی والا جھولا، غوطہ لگانے والا جھولا، مائی فیر لیڈی، اجگر کی شکل میں ریل پر چلنے والی ٹرین، چھوٹی چھوٹی کاریں جو بجلی سے چلتی تھیں، چھوٹے چھوٹے جھولوں کی تعداد بتانا مشکل۔ایک طرف سرکس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دکانوں کا تو کہنا ہی کیا۔ایسا لگ رہا تھا ساری دنیا کی دکانیں نوچندی میں آ جائیں گی۔ ہر سامان کی دکانوں کی الگ لائن...... پلاسٹک کے کھلونے کی دکانوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کراکری کی دکانوں کی قطار، آرائش وزیبائش کی دکانیں...... کپڑے کی دکانیں ایک طرف تھیں۔موسم تبدیل ہو گیا تھا۔سردی اپنا بستر سمیٹ چکی تھی۔ میدان کے راستوں پر پانی کا چھڑکاؤ...... پانی اتنا بہایا جاتا کہ کبھی کبھی بجائے خوشگوار لگنے کے اور مصیبت ہو جاتی۔ کیچڑ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں پھسلن بھی ہو جاتی۔درمیانی راستوں پر لگی اینٹوں کی باڑھ کو سفید رنگ سے

رنگا گیا تھا۔ راستوں میں سرخ رنگ کا بدر پور ڈالا گیا تھا۔

نوچندی میدان میں نصب قومی رہنماؤں کی مورتیوں کو اسی بہانے صفائی ستھرائی ہو جاتی تھی۔ نئے سرے سے رنگ و روغن کیا جاتا۔ سال بھر کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ سارے میدان میں بھینسوں کے کئی تو یلے بن جاتے، بچوں کی ٹولیاں کرکٹ کے میچ کھیلا کرتیں، لیکن مارچ کا مہینہ جب ہولی کا تہوار لئے آتا تو نوچندی میدان کی جیسے قسمت ہی جاگ پڑتی۔ شاید اس میدان کا وجود سال بھر میں دو ماہ کے میلے کے لئے تھا ہی۔ میدان کے کئی راستے تھے، ترنگا گیٹ، شمبھو داس گیٹ، مچھلی گیٹ، بالے میاں کا راستہ، پٹیل منڈپ والا راستہ...... اس راستے کے بائیں نوچندی میلے کا آفس ہے جو پٹیل منڈپ کا ہی حصہ ہے۔ پٹیل منڈپ ایک بڑا سا پروگرام ہال ہے جس میں میلے کے دوران ادبی، سماجی اور تہذیبی پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔

نوچندی میلے میں یوں تو ہر چیز دیکھنے لائق ہوتی تھی لیکن موت کا کنواں یہاں کا منفرد پروگرام ہوتا ہے۔ میلے کے شباب کے دنوں میں لوگوں کا ریلہ ہوتا ہے۔ چاروں طرف شور شرابہ، لاؤڈ اسپیکروں سے آوازوں کا طوفان پورے میلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سب سے زیادہ کان پھاڑنے والی آواز، موت کا کنواں، کے باہر لگے بڑے بڑے اسپیکروں سے پھوٹتی ہے۔ موسیقی اور گانوں کی تقریباً چیختی آوازوں کے دوران اعلان بھی جاری رہتا ہے۔

"آیئے...... آیئے...... موت کا کنواں دیکھئے۔"

"ایک ساتھ تین تین موٹر سائیکلوں کا تماشا دیکھیں۔"

"موٹر سائیکلوں کے ساتھ تین تین کار بھی دوڑیں گی۔"

"موت کے کنوئیں میں لڑکی کا کارنامہ دیکھیں۔"

"ہر...... ہر...... رارا......" ایک طرف موٹر سائیکل کا ڈرائیور صرف اکسلیٹر دے کر پروگرام شروع ہونے کا لالچ دیتا رہتا ہے۔ جب کہ پروگرام کافی دیر بعد شروع ہوتا۔ پورا مچان بھر جانے کے بعد کھیل شروع ہو گیا تھا۔ موٹر سائیکلیں اور کاریں ایک دوسرے سے آگے، پیچھے برق رفتاری سے دندناتی پھر رہی تھیں...... ڈرائیور اپنے اپنے کرتب دکھلا رہے تھے...... تالیاں بج رہی تھیں، سب سے زیادہ تالیاں موٹر سائیکل والی لڑکی کے کرتب پر بج رہی تھیں...... کھیل کے اختتام پر سب کی زبان پر لڑکی کے کرتب تھے۔ آہستہ آہستہ پورے میلے اور شہر میں لڑکی کی

شہرت پھیل گئی تھی۔

بلی ایک چھوٹے سے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد اسے اور اس کی والدہ آشا کو کم عمر میں ہی دنیا کے ویرانے میں چھوڑ گئے تھے۔ آشا نے محنت و مشقت کر کے بلی کی پرورش کی تھی۔ آشا گھر گھر کام کاج کرتی ا، کسی طرح اپنی اور بلی کی زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔ بلی دس سال کی تھی جب اس کے والد مان سنگھ ایک حادثے میں موت کا شکار ہو گئے تھے۔ حادثہ کمپنی کے اندر ہوا تھا، بجلی فیل ہو جانے پر اس کی جانچ کے لئے وہ بجلی کھمبے پر چڑھے تھے۔ اچانک بجلی آ گئی اور پل کے پل میں روح آسمان اور جسم زمین پر تھا۔ بلی اور آشا ان کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ہوش آنے پر وہ پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں تھیں۔ مان سنگھ کی موت کے بدلے انہیں دس ہزار روپے ملے تھے...... جو دس مہینے بھی ساتھ نہیں نبھا سکے۔ آشا نے کمپنی کے بہت چکر لگائے، مگر بے سود، کسی نے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ آشا کو ہر طرف نراشا ہی ہاتھ لگی۔ وہ بھری پری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اب تو اس کی دنیا، اس کی منزل، اس کی بیٹی بلی تھی...... خدا کا شکر تھا کہ مان سنگھ نے اپنی زندگی میں سر چھپانے کو ایک جھونپڑی ڈال لی تھی۔

بلی آہستہ آہستہ جوانی کا پالا چھو رہی تھی، اس نے آنگن باڑی جیسے اسکولوں سے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی تھی۔ پڑوس کا ایک لڑکا آکاش، کبھی کبھار اس کے گھر آ جایا کرتا تھا۔ وہ بی اے کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی میں سروس کرنے لگا تھا۔ اس کے پاس اپنی بائک تھی۔ اس کے والد صوبیدار یوگیش شرما فوج سے ریٹائر تھے۔ مان سنگھ کے حادثے کے وقت یوگیش شرما نے، آشا اور بلی کی بہت مدد کی تھی۔ صوبیدار شرما کی بیوی آشا اور بلی کا ہر طرح خیال رکھتی تھی...... آکاش بھی کبھی کبھار خیریت لینے آ جاتا تھا، بعد میں آشا نے صوبیدار یوگیش شرما کے یہاں خانہ داری کا کام کر لیا تھا۔ آشا کئی گھروں میں کام کرنے لگی تھی۔ پورے محلے کو آشا اور بلی سے ہمدردی تھی لیکن انسان کے کتنے ہی ہمدرد ہوں، زندگی کی گاڑی خود ہی کھینچنی پڑتی ہے۔ آشا نے بھی زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کے لئے ایک نرم و نازک کندھے لگا دئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کا ہر ممکن خیال رکھتی تھی۔ جیسا بھی ممکن تھا وہ اسے پڑھا رہی تھی۔

بلی کو بچپن ہی سے سائیکل، اسکوٹر اور بائک اچھی لگتی تھی۔ دوسرے بچوں کو سائیکل چلاتے

دیکھ اس کا دل مچل جاتا تھا۔ اسکول میں اس کے کئی ساتھیوں کے پاس سائیکل تھی۔ وہ انٹرول کے وقت ان سے سائیکل مانگ کر سیکھا کرتی تھی۔ اسی طرح اسے سائیکل چلانا آ گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا رنگ تو بہت صاف نہ تھا لیکن جوانی نے اس کے جسم پر جاذبیت کا غازہ مل دیا تھا۔ آکاش کی طرف اس کا دل کھنچا جاتا تھا۔ آکاش بھی اسے دل ہی دل میں چاہتا تھا۔ آکاش کا گھر گو اس کے گھر سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا لیکن کبھی کبھا وہ اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے آکاش کے گھر چلی جایا کرتی تھی...... ایک دن آشا کی طبیعت خراب تھی، اس نے ببلی سے کہا۔

"بیٹا ببلی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم صوبیدار صاحب کے یہاں کام کر آؤ۔"

"ٹھیک ہے ماں، تم آرام کرو، میں کام نپٹا کے آتی ہوں۔"

ببلی صوبیدار صاحب کے گھر جب پہنچی تو اسے پتہ چلا کہ آج صبح ہی میاں بیوی آکاش کے ماموں کے یہاں چلے گئے ہیں۔ گھر پر آکاش اکیلا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پڑھائی میں مصروف تھا۔ اس نے گھر کی صفائی کی، برتن صاف کئے۔ ناشتہ تیار کر کے جب وہ آکاش کے کمرے میں لے گئی تو آکاش کو نہ پا کر حیران رہ گئی۔ ناشتے کی ٹرے ہاتھ میں لئے وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اچانک کسی نے پیچھے سے اسے پکڑ لیا۔

"کون ہے......؟" مارے ڈر کے وہ کانپ گئی۔ "آکاش میرا دل کمزور ہے۔"

ڈر کے بعد جب ہوش ٹھکانے آئے تو اسے محسوس ہوا کہ یہ زندگی کا پہلا موقع ہے جب اس نے کسی کا لمس حاصل کیا ہے۔ پہلے لمس کی لذت کا کیا کہنا، اس پر نشہ سا طاری ہونے لگا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ آکاش کی مضبوط بانہوں کی گرفت میں وہ کچھ ایسی گرفتار تھی کہ سب کچھ بھول گئی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ آکاش کی وسعتوں میں محو پرواز ہے۔

دوسری طرف آکاش بھی حسن کی فتح پر مخمور تھا۔ اس کے اندر خواہش شدید ہو رہی تھی کہ کاش زمین و آسمان کا یہ ملن یوں ہی ہوتا رہے۔ یہ لمحات قید ہو جائیں، وقت ٹھہر جائے۔ حسن اسی طرح عشق کی بارگاہ میں سجدہ ریزہ رہے۔

"دھڑام......" زور کی آواز کے ساتھ پانی کا گلاس زمین پر تھا۔

اچانک سب کچھ ختم ہو گیا۔ دونوں سنبھل گئے۔ حسن و عشق شرمندہ شرمندہ سے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ جب کہ وہ ایک دوسرے کا دل چرا چکے تھے۔ محبت کی تخم

ریزی ہو چکی تھی۔ ببلی نے جلدی جلدی کام پورا کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آ گئی۔

آشا کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ گھر کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ وقت کب رکتا ہے۔ پیٹ کمبخت کب سکون لینے دیتا ہے۔ کچھ بھی ہو اسے تو ایندھن چاہیے ہی۔ ببلی 17 سال کی ہو گئی تھی۔ آکاش اور وہ ایک دوسرے کو خوب چاہنے لگے تھے۔ آکاش کی محبت میں ببلی کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس نے اپنا برسوں پرانا خواب پا لیا۔ آکاش نے اسے بائک چلانا سکھا دیا تھا۔ کئی بار وہ آکاش کو بٹھا کر بائک کا سفر کیا کرتی...... اسے بڑا مزہ آتا۔ کھلی سڑک پر وہ خوب تیز بائک چلاتی۔ آکاش اسے سمجھاتا، تو وہ کہتی۔

''آکاش رفتار ہی زندگی ہے۔''

''پر ہوش میں رہنا چاہئے۔''

''ہاں، میں قابو میں ہی رفتار بڑھاتی ہوں۔''

ایک بار اس نے آکاش سے کہا۔

''آکاش میں بائک سے آسمان پر اڑنا چاہتی ہوں۔''

''پاگل ہو گئی ہو۔ سیدھا اوپر چلی جاؤ ں گی، آکاش سے بھی اوپر۔''

''نہیں۔ میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں خوب...... خوب تیز بائک دوڑاؤں۔''

''زمین پر آ جاؤ......''

''تم مذاق نہ اڑاؤ...... ''میں سمجھا رہا ہوں'' ارے آکاش...... اس نے آکاش کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ کنویں میں بہت تیز موٹر سائیکل چلتی ہے اور وہ ہوا میں بھی چکر لگاتی ہے۔''

''ہاں بابا...... مگر تمہیں آج یہ کیا ہو گیا ہے۔'' آکاش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔'' نیچے زمین پر آ جاؤ۔''

''آکاش میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاؤں گی۔ مجھے نہیں پتہ۔ تم مجھے سکھاؤ گے۔''
نہیں نہیں...... بہت خطرناک کھیل ہوتا ہے۔ لڑکیاں یہ سب نہیں کر سکتیں اور تم تو سوچو بھی مت۔''

''مجھے نہیں پتہ...... مجھے تو یہ کھیل کھیلنا ہے...... اگر تم نے میرا یہ خواب پورا نہیں کیا تو مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔'' ببلی نے صرف کہا ہی نہیں، وہ ناراض ہو کر چل پڑی۔ آکاش

نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور بولا۔

"اچھا بابا میں کوشش کروں گا......بس......اب مسکرا دو......" اور حسن مسکراہٹ نے کائنات کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہوائیں مسکرا پڑیں۔ پرند چہچہانے لگے۔ درخت ہوا میں جھومنے لگے۔ چاند تارے روشن ہو گئے۔ اجالا خوش ہو کر سیاہی کے آنچل میں اپنے وجود کے ساتھ ضم ہو گیا۔ آکاش کا کونا کونا منور ہو گیا تھا۔

آکاش نے میلے میں لگنے والے موت کے کنویں کے مالک سے بات کر کے ببلی کی ٹریننگ شروع کرا دی۔ ببلی نے ماں کو بھی منا لیا تھا کہ اب زندگی کی گاڑی ببلی کو ہی کھینچنی ہے۔ جب شوق اور پیشہ ایک ہو جائیں تو کیا کہنا؟ ابتدا میں ببلی کچھ پریشان سی ہوئی۔ کئی بار گری بھی...... چوٹ بھی کھائی...... جیسے جیسے موٹر سائیکل نیچے سے اوپر کنویں کی دیواروں پہ دوڑتی، ببلی گھبرا جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ اس کے استاد نے اسے بتایا کہ ہمیشہ ایکسلیٹر تیز رکھو۔ ایک دو بار چکر لگانے کے بعد موومنٹ بن جاتا ہے۔ پھر رفتار پر قابو رکھ کر آسانی سے کرتب دکھائے جا سکتے ہیں۔

ببلی نے ایک ماہ کی تربیت کے بعد بائک چلانے میں مہارت حاصل کر لی۔ اب وہ چلتی بائک پر کرتب بھی دکھانے لگی تھی۔ چلتی ہوئی کار کے ڈرائیور کا ہاتھ پکڑ کر چکر لگانا، تیز رفتار بائک سے تماشائیوں سے نوٹ لپک لینا، بائک کے ایک طرف کھڑے ہو جانا، بیٹھ کر بائک چلانا...... یہ سب کرتے ہوئے اب اسے مزہ آنے لگا تھا۔ اب وہ پوری طرح ٹرینڈ ہو چکی تھی...... کنویں کے مالک نے اس کو پہلی بار کھیل دکھانے کا موقع دیا۔ اعلان مسلسل ہو رہا تھا۔

"موت کے کنویں میں لڑکی کے کرتب دیکھیں...... آئیں......"

"آیئے...... آیئے...... صرف دس روپے میں۔"

میلے میں موجود ہجوم نے موت کے کنویں کا رخ کیا۔ انہوں نے پہلے کبھی لڑکی کو بائک چلاتے نہیں دیکھا تھا۔ کنویں کا اسٹینڈ لوگوں سے بھر چکا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے اوپر سوار تھے۔ بچے جالیوں سے لگے تھے...... کھیل دیکھنے کو آکاش اور اس کے گھر والے اور ببلی کی ماں آشا بھی آئی تھی۔ آشا کا حال برا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ دل کی ہر دھڑکن جہاں خوف سے لبریز تھی وہیں بھگوان سے پرارتھی بھی...... "ہے بھگوان میری بیٹی کو سنبھالو......"

"ہر ہر......"

کنویں کے اندر گاڑیاں اسٹارٹ ہونے لگی تھیں۔ ایک بائک سوار تیزی سے بائک چلاتا ہوا نیچے سے اوپر آ گیا۔ کنویں کی دیواریں ہلنے لگی تھیں۔ دوسرے بائک سوار نے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ تیسری بائک پہ سوار ببلی نے اپنا سفر شروع کیا۔ آشا نے آنکھیں موند لیں۔ اتنے شور میں بھی اسے اپنی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا تو لوگ ببلی کے کرتب پر تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کی بیٹی ہاتھ ہلا کر داد قبول کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک طرف دم سادھے آکاش کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ببلی کی کامیابی اس کی کامیابی تھی۔ اسے لگ رہا تھا گویا وہ کنوئیں کے اندر ایک بائک پر سوار ہے اور ببلی کی بائک کے برابر چل رہا ہے۔ ببلی نے اس کا ہاتھ تھام رکھا ہے، دونوں تیز چل رہے ہیں۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔

وقت پرواز کرتا رہا۔ ببلی سرکس اور میلوں میں موٹر سائیکل چلانے اور کرتب دکھانے کے لئے مشہور ہوتی گئی۔ اب گھر کے حالات بھی بدلنے لگے تھے۔ آشا اور ببلی امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ آشا کو بیٹی کی شادی کی بھی فکر تھی۔ ببلی ۲۲ سال کی ہو رہی تھی۔ آشا کو ببلی اور آکاش کے پیار کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بار ببلی کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔

"بیٹی ببلی وہ بڑے لوگ ہیں، ہم ان کے برابر نہیں۔"

"ارے ماں تم بھی پرانے زمانے کی ہو۔ یہ موڈرن زمانہ ہے، اب کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ لیکن تم میری بات مانو...... آکاش سے صاف بات کرلو۔ شادی کے بارے میں اس کی کیا رائے؟"

"ماما...... شادی ضروری ہے کیا؟...... میں تو اسی طرح ٹھیک ہوں......"

"نہیں بیٹا...... سماج کے اصولوں کو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ تم کہو تو میں آکاش سے بات کروں؟"

"نہیں ماں...... میں خود بات کرلوں گی۔"

اگلے دن جب آکاش سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ بول پڑی۔

"آکاش اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے؟"

"ہاں............ ہاں............ کیوں نہیں............ میں اپنے پتا جی سے بات کروں گا۔ وہ

مان جائیں گے۔"

آ کاش نے ببلی کا دل رکھنے کو کہہ ضرور دیا مگر اسے یقین تھا صوبیدار صاحب کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ان کا بیٹا، نوکرانی کی بیٹی سے شادی کرے...... وہ فکر مند ہو گیا۔ وہ ببلی کو دل و جان سے چاہتا تھا...... ان کے پیار کو لگ بھگ ۵ سال ہو گئے تھے۔ اس دوران اس کی ترقی ہو گئی تھی۔ اب وہ کمپنی میں اسسٹنٹ مینجر تھا۔ اس کے والدین کو بھی اس کی شادی کی فکر تھی، وہ اس کی شادی اپنے دوست آرمی افسر آر پی سنگھ کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے، جو ایک اسکول میں ٹیچر تھی...... آ کاش کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے والدین سے ببلی کے متعلق بات کرتا یا شادی کی بات سے انکار کر دیتا۔ دوسری طرف ببلی کو چھوڑنا بھی اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ عجیب شش و پنج میں تھا۔ ایک طرف پیار، دوسری طرف والدین کی رضا مندی اور دو پاٹوں کے درمیان آ کاش کا وجود...... اس بیچ خود بخود راستہ نکل آیا...... اچانک اس کا تبادلہ دلی ہو گیا...... اس کو، اپنے والدین کے ساتھ وہاں جانا پڑا۔ وقت رخصت، ببلی کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیوں کے ساتھ، امید کے بادل بھی تھے جو اس کی زندگی کے آ کاش پر محو رقص تھے۔ اس نے آ کاش اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

ببلی "آ کاش...... تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ یہ جان لینا، میرا جسم صرف یہاں ہو گا۔ روح تمہارے پاس ہی رہے گی۔"

آ کاش "ببلی۔ میرا بھی یہی حال ہو گا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔"

ببلی کی آنکھوں میں موتیوں کی لڑی تھی، ایک موتی فنا ہو کر معراج پا رہا تھا۔ اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر آ کاش کو سمیٹ لیا۔

"آ کاش تم میرے ہو۔ صرف میرے......"

آ کاش کی آنکھوں کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ وہ اپنے پہلے پیار کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دل کو مضبوط کر کے س نے والدین سے ببلی کے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دہلی میں سیٹ ہونے کے بعد وہ اپنے والدین سے بات کرے گا...... آہٹ پر دونوں بجلی کی سی سرعت سے الگ ہو گئے تھے...... آشا آ گئی تھی...... آ کاش ان سے اجازت لے کر واپس لوٹ گیا۔

دہلی آئے ہوئے آ کاش کو تین ماہ گئے تھے۔ مکان وغیرہ سب سیٹ ہو گیا تھا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ والدین سے بات کرے گا کہ اچانک ایک دن شام میں آر پی سنگھ اور ان کی فیملی

آ گئی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ آر پی سنگھ کی بیٹی چندر کلا بھی ان کے ساتھ تھی۔ چندکلا اپنے نام کے عین مطابق تھی۔ چھوٹی سی محفل بجی...... رشتے کی بات ہوگئی۔ وہ اپنے والدین سے بات تک نہ کر سکا۔ پھر چندر کلا کا مترنم لہجہ، بات کرنے کا سلیقہ، بارعب شخصیت، حسن کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ تو سلیقے کی آمیزش سے دوآتشہ ہوگیا تھا۔ آکاش کے دل میں چندر کلا ساہ بدلیوں سے بھرے آسمان میں آہستہ آہستہ نمودار ہونے والے چاند کی طرح داخل ہوئی اور آکاش کے گوشے گوشے میں چاندنی کی چادر بچھا گئی۔

آکاش کی غیر موجودگی میں ببلی کا حال بھی اچھا نہیں تھا۔ اس نے اب اپنے آپ کو سمیٹ لیا تھا۔ وہ اپنا کام کر کے واپس گھر آ جاتی تھی۔ والدہ کے ساتھ وقت گزارتی۔ اسے تین ماہ بعد بھی آکاش پر بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اس پر سایہ فگن رہے گا اور ہمیشہ سورج کی تپش سے اسے محفوظ رکھے گا...... آشا اکثر ببلی کو سمجھاتی۔ بیٹا میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تم کیوں اپنا وقت خراب کر رہی ہو۔ آکاش کو بھول جاؤ۔ وہ نہیں آنے والا...... مجھے اب اس کے آنے کی کوئی آشا نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا وہ بڑے لوگ ہیں۔

ماں کے سمجھانے پر اکثر ببلی ان سے الجھ جاتی۔

"ماں۔ آکاش آئے گا...... آپ کی غریب بیٹی کے ہاتھ پیلے ہوں گے......"

ایک دن بہت زور کی آندھی آئی۔ تیز ہوا نے دھول کے ساتھ مل کر کوب طوفان اٹھایا۔ ہر طرف طوفان ہی کا راج تھا۔ ببلی گھر میں اداس بیٹھی تھی۔ اس کے اندر بھی طوفان برپا تھا۔ خبر آئی تھی کہ آکاش اب اس کا نہیں رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ دل کی کشتی، جذبات کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اسے ہر چیز گھومتی نظر آ رہی تھی۔ باہر طوفان نے اپنے زور سے زبردست تباہی مچا رکھی تھی۔ پرانے درخت زمین پر آ رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے، پھوس کی چھپر، ٹین کی چادریں۔ حتیٰ کہ کمزور دواریں بھی طوفان کے ساتھ تیز بارش کے جھونکوں سے زمین سے پیار کرنے لگی تھیں......

برسوں بعد آکاش اور چندر کلا نوچندی کے میلے میں آئے تھے...... میلہ اپنے شباب پر تھا۔ ہر طرف شور، شرابہ، کھانے کی دکانیں...... ہر طرح کے کھانے پ وتج، نان وتج، ساؤتھ

انڈین، چائینیز، حلوا پراٹھا کی خوشبو، کبابوں کی مہک، نان خطائی پوپ کورن کی خوشبو سے میلے کی فضا معطر تھی۔ گھومتے گھومتے دونوں موت کا کنویں کے پاس پہنچے تو چندر کلا مچل گئی......

"موت کا کنواں دیکھیں گے......"

آ کاش کی دلچسپی ختم ہوئے زمانہ ہو گیا تھا۔ اسے اب کنویں دیکھنا بھی خوفناک لگتا تھا۔ ببلی کا ہیولا کنویں سے نکل کر اسے دبوچ لیتا تھا...... اس نے چندر کلا سے بہت منع کیا، طبیعت کی خرابی کا بہانہ بھی بنایا...... لیکن چندر کلا نہیں مانی۔ اس نے خود ٹکٹ بھی لے لیے اور آ کاش کو تقریباً کھینچتی ہوئی لوہے کی جالیوں دار سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے کافی اونچائی پر بنے مچان پر پہنچ گئی۔ مچان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کنویں میں نوجوان اپنی بائک کے شور سے کھیل شروع ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ کنویں کا دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔

"شن--" اور ایک بائک سوار نے بائک سے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ دوسرا بھی اوپر آ گیا۔ دونوں کے چکر سے پورا کنواں ہلنے لگا تھا۔ دیکھنے والوں کے دل دہلنے لگے تھے۔ اچانک شور بلند ہوا۔ تالیاں بجیں۔ تماسے میں تیسری بائک بھی شریک ہو گئی تھی۔ بائک سوار لڑکی تھی۔ لوگ حیرت سے کھیل دیکھ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ کھیل میں کاریں بھی شریک ہو گئیں۔

"شائیں، شائیں، ہر ہر......

پورا کنواں بری طرح ہل رہا تھا۔ آہنی ڈھانچہ کانپ رہا تھا۔ چندر کلا کنویں کے کنارے پر تھی اس نے بہت مضبوطی سے آ کاش کو تھام رکھا تھا۔ کھیل عروج پر تھا۔ بائک سوار اور کار والے کرتب دکھا رہے تھے۔ ایک ایک کار ڈرائیور اور بائک سوار نے ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔ تین جوڑے پوری رفتار سے کنویں میں چکر لگا رہے تھے۔ آ کاش کا ذہن بھی چکر کھا رہا تھا۔ وہ حیرت سے پورا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ببلی گھوم رہی تھی۔ ببلی کے ساتھ گزارے لمحات، کنویں میں ببلی کے کارنامے۔ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ ادھر کار کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تینوں کاریں ایک کے بعد ایک نیچے پہنچ گئی تھیں۔ موٹر سائیکلیں بھی اتر رہی تھیں۔ دو نیچے آ رہی تھیں۔ جبکہ ایک بائک اوپری سطح پر ہی چکر لگا رہی تھی۔ تماشائی تالیاں بجا رہے تھے۔ ایک تماش بین نے دس روپے کا نوٹ لہرایا۔ بائک سوار لڑکی نے نوٹ لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ نوٹ تک پہنچنے سے قبل لمحے کے سویں حصے میں اچانک اس کی نظروں نے آ کاش کو دیکھا۔ آ کاش کے برابر میں ایک خوبصورت لڑکی تھی جس نے آ کاش کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ نوٹ پکڑنے میں اس کا توازن متزلزل ہو گیا۔ پھر کیا تھا...... بائک کا اکسیلیٹر

اچانک بہت تیز ہو گیا۔ بائک ہوا میں لہرائی، لوگوں کی نظریں بائک پر تھیں ایک فلک شگاف دلدوز چیخ بلند ہوئی اور بائک ''دھڑام'' سے کنویں کی زمین پر تھی۔

لڑکی نیچے پڑی تھی۔ اس کا جسم جامد و ساکت تھا۔ پورے کنویں میں کہرام مچ گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ ہر طرف چیخ پکار تھی۔

''لڑکی مر گئی......'' کوئی چلایا۔

''پولس کو بلاؤ......''

''لڑکی کو اسپتال لے چلو......''

آکاش اور چندر کلا بھی گرتے پڑتے بھیڑ سے باہر نکلے۔ آکاش کا دل، سینے میں نہیں تھا۔ وہ لڑکے کے بارے میں جاننے کو کنویں کے اندر جانا چاہتا تھا۔ چندر کلا نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

''آکاش گھر چلو...... چھوڑو۔ مر گئی ہوگی۔ یہ موت کا کنواں ہے۔''

چندر کلا کے لفظوں نے آکاش کے دل میں برچھیاں چبھو دی تھیں، شگاف ڈال دیئے تھے۔ اس کے سامنے موت کا کنواں تھا، یہی موت کا کنواں جس نے بلّی کو زندگی عطا کی تھی آج اس کے آخری سفر کا بھی گواہ بن گیا تھا۔

✠ ✠ ✠

ظہیر صدیقی اور تخیل کا آہو

وہاب اشرفی

''روش ورق ورق'' میرے ذی علم دوست اور ساتھی ظہیر صدیقی کا مجموعہ کلام ہے۔ انہوں نے مجھے یہ مجموعہ بھیجا تو میرے لئے محترم المقام کا لقب استعمال کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ظہیر صدیقی واقعی صوفی ہو گئے ہیں اور شاید مجھے اپنے دوستوں کی صف میں رکھنا نہیں چاہتے۔ ویسے میں ان کے علم وکمال کا بہت زمانے سے معترف ہوں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''ماسوا'' شائع ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ جدیدیت کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں اسی وقت بیحد معروف ہو جانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی جدیدیت دراصل ان کے ذاتی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ جس میں ملارمے، رینبو، بادلیر اور کئی دوسرے علامت پسندوں کی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ موقع ہے کہ میں اپنے اس پرانے مضمون جو آج سے تقریباً بیس (۲۰) سال پہلے لکھا گیا تھا ''ظہیر صدیقی: ایک جدید شاعر'' کا ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں:-

''ظہیر صدیقی کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک علامت منتخب کر لیتے ہیں۔ اس علامت کی حیثیت مرکزی ہوتی ہے، پھر اسے واضح کرنے کے لئے اسی سے مطابقت رکھنے والی تمثالیں ڈھونڈتے ہیں۔ موضوع کے برتنے

کا یہ طریقہ کار کسی موضوع کے قدامت پر ایک دبیز پردہ ڈال دیتا ہے اور اب جو چیز سامنے آتی ہے اس میں تازگی کا وصف نمایاں ہوتا ہے۔ سمبولسٹ تحریک کے علمبرداروں کا خاصہ یہی تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ جدید شاعری کا ڈانڈا اس تحریک سے ملتا ہے۔ چنانچہ ظہیر بھی سمبولسٹ ہیں اور اسی تحریک سے وابستہ لوگوں کے لئے بقول SYMONS جہاں ہماری نمایاں دنیا حقیقی باقی نہیں رہی ہے وہاں ان دیکھی دنیا محض خواب نہیں۔ واضح ہو کہ چیزوں کو نئے اور علامتی انداز سے دیکھنے اور سمجھنے کا رجحان سمبولسٹ تحریک سے وابستہ ہے۔ ظہیر کا انداز بھی یہی ہے اور وہ جدید اسی لئے ہیں کہ سمبولسٹ ہیں۔ اس سلسلہ میں فرانسیسی سمبولسٹ شاعر MALLARME کے مشہور و مقبول سانیٹ Leviergele Vivace Et Legel Argou اور ظہیر کی نظم 'برف کی سل' کا تقابلی جائزہ میرے نقطہ نظر کی وضاحت میں معاون ہوگا۔ سانیٹ Levierg میں ہنس ایک علامت ہے۔ اس کے احوال برفیلی پس منظر میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ اتھاہ ٹھنڈک کے پنجڑے میں مقفل اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ آخر کار شدید ٹھنڈک اسے بھی برف بنا دیتی ہے۔ اسی سانیٹ میں 'سفیدی' اور 'ٹھنڈی تکمیل' جیسی اصطلاحیں اشکال کی صورت میں آئی ہیں۔ نقادوں نے ان علامتوں کو نامردی اور موت سے تعبیر کیا ہے اور یہ پوری نظم ٹھنڈی المیہ فضا رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں 'برف کی سل' کا مطالعہ کیجئے:

[۱] اجلی چادر پہ پسینے کے امنڈتے ہوئے رنگ
[۲] مری آغوش میں اک برف کی سل
[۳] سردئ قرب..........
[۴] ایک چنگاری سے کب برف کی سل پگھلی ہے
[۵] برف کی سل بھی الگ ہوتی ہی نہیں اور
[۶] میں بھی یہی برف کی سل ہو جاؤں

یہاں 'برف کی سل' علامت بھی Sterility ہی ہے۔ 'اجلی چادر' سفیدی کی طرح ایک

امیج ہے۔ لیکن ان دونوں نظموں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ Mallarme کی
اسٹریلٹی اس کی اپنی اسٹریلٹی ہے، لیکن ظہیر، اپنی ہم آغوش جنس میں یہ کیفیت پاتے
ہیں اور ان کی نظم کا بنیادی ڈھانچہ تضادات پر ہے۔ ایک طرف گرمی ہے اور دوسری
جانب ٹھنڈک لیکن ٹھنڈک اور سفیدی بہر حال دونوں کے یہاں اسٹریلٹی کا امیج بنی
ہے۔" (''معنی کی تلاش''، ص ۱۳۵، ۱۳۶)

لیکن اب ظہیر صدیقی جدیدیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے واقعتاً تصوف سے اپنا گہرا رشتہ قائم کرلیا ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ویسے ظہیر بنیادی طور پر نظموں کے ہی شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے میں یہاں زیادہ تر ان کی غزلوں سے متعلق لکھوں گا۔ مجموعہ حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے اور غزلیں حافظ کے دو شعر کے اندراج کے بعد۔ پہلے حافظ کے وہ دونوں شعر ملاحظہ ہوں:

حافظ از سیم و زرت نیست بروشاکر باش
چہ بہ از دولت لطف سخن و طبع سلیم

گوہر پاک بباید کہ شود قابل فیض
ور نہ ہر سنگ و گلے لولو و مرجاں نشود

ظہیر گوہر پاک بباید کی قابل فیض راہ پر چل نکلے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے اشعار میں حافظ کی سرمستی کا احساس ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ لذت شرب مدام کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں، لہٰذا ان کا حساس دل اپنی ذات کی آگہی کی تلاش بھی کرتا ہے اور ذہن کو آئینہ بنانا چاہتا ہے لیکن انہیں احساس ہے کہ:

ذات کی آگہی بہت مشکل
ذہن کا آئینہ بھی جھوٹا ہے

دراصل اپنی تلاش کا جو کھم الہیات کے سفر کی سرگوشی کرتا ہے:

خود اس کے ہی نافے میں مفہوم کی خوشبو ہے
بے وجہ ہی سرگرداں تخئیل کا آہو ہے

دیکھا آپ نے، ظہیر کس طرح اپنی تلاش میں کس قدر اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایسی اڑان زمین کے رشتے سے منقطع ہونے نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے الوہی تصور میں زندگی کے وہ شب و روز بھی ہیں جن سے ہم آپ روز ہی گزرتے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے احوال سے معلق نہیں ہوتے لیکن ان کے ابتذال سے بچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں آزمائشوں سے گزر سکتے ہیں۔ ایک شعر دیکھئے:

ہزار سیر شکم ہو یہ لالچی دھرتی
لہو کی بوند اسے پھر بھی آزمائے گی

اس کے علاوہ:

اڑان جتنی ہو اونچی ، کبوتر آخر
غذا کے واسطے سطح زمیں پہ آئے گی

گویا ظہیر ایسی ماورائی منزلوں سے نہیں گزرتے جہاں آپے میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں احتیاط کا پہلو ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ظہیر کے یہاں کہیں کہیں زندگی کی کیفیات کا وہ شاعرانہ اظہار ملتا ہے جو زندگیوں کی تلخیوں سے عبارت ہے۔ صرف تلخیاں ہی نہیں بلکہ آج جو تشدد کی کیفیت ہے اس پر بھی یہ نگاہ رکھنے کی سبیل پیدا کرتے ہیں، لیکن اظہار میں نہ تو شور ہے اور نہ غوغا۔ پھر بھی ہلکی سی چیخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی سلسلے کے تین اشعار اور وہ بھی ایک غزل کے دیکھئے:

وہ ساحل حریص کی پلکیں بھگو گئے
موتی اچھال کر جو تہہ آب کھو گئے
ماتم گسار لاش پہ اس طرح رو گئے
قاتل کی انگلیوں کے نشانات دھو گئے
اشکوں سے سینچتے رہے اشجار بے ثمر
اسلاف کشت ذہن میں وہ بیج بو گئے

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ محض ایک نسل کا نہیں بلکہ یہ کیفیات نسل در نسل سے عبارت ہیں۔ ظہیر ایسے احساسات کی ترجمانی کے لئے انتہائی رواں دواں سامنے کے الفاظ چن لیتے ہیں اور

معنویت کی گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کے یہاں ایسی حسی کیفیت ملتی ہے جو نزاکت پر دال ہے۔ اس کیفیت کو شعر بنانا آسان نہیں تو شعر ملاحظہ ہوں:

ایک لمحہ کی خطا پھیلی ، تو ساری زندگی
چبھتے ذرے کانچ کے پلکوں سے چنواتی رہی

محسوس کیا جا سکتا ہے کہ کتنی بڑی بات کتنی نفاست اور نزاکت سے بیان کر دی گئی۔ لمحے بھر کی بھول اور غفلت کہاں سے کہاں لے جا سکتی ہے اور زندگی کو کیسے کیسے کرب سے آشنا کر سکتی ہے۔ اور یہ لمحے کی خطا کیسی ہے، کیا ہے؟ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ تقسیم ہند کا المیہ ذہن میں ہوتا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ حرف وصوت پر بہت سے اشعار کہے گئے ہیں۔ اور کہے جاتے رہیں گے لیکن اس احساس کو ظہیر صدیقی تخیل سے جوڑتے ہوئے طبعی کیف کا اظہار کرتے ہوئے کیسی منزلیں طے کر سکتے ہیں اس کا اندازہ کوئی بھی لگا سکتا ہے:

لمس حرف وصوت کی لذت سے واقف تھی، مگر
پہلوئے آواز میں تخیل شرمائی رہی

میں کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ پہلوئے آواز میں تخیل کا شرمانا اور پھر لمس حرف وصوت کی لذت سے وابستگی کا تصور پوری طویل بیانیہ نظم کی متقاضی ہے۔ لیکن اس کو کیا کہئے کہ غزل کا اپنا مزاج ہے جو ہنر مندی اور ذی شعور تخلیقی ذہن رکھنے والوں کے لئے اس طرح تعاون کرتا ہے کہ بڑی سے بڑی بات دو مصرعوں میں سمٹ آتی ہے۔ یہاں بھی یہ صورت دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسے بہت سارے اشعار ''روشن ورق ورق'' میں تلاش کئے جا سکتے ہیں:

کسی سہارے کی آرزو نے شناوروں کو شکست دی ہے
مہیب موجوں نے کیا بگاڑا، حقیر تنکوں نے جان لی ہے

کرن نے لوٹا ہے اس کا زیور، ہوا نے اس کا لباس اتارا
برہنہ ٹہنی بدست گلچیں تمام ، انگوں سے کانپتی ہے

رسول تخیل ہر قدم پر سروش الفاظ کا ہے مرہوں
مگر جہاں سے یہ بڑھ گیا ہے وہیں ہر آواز جل گئی ہے

محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر نے کیسے کیسے تصورات کو اپنی تخلیقی قوت سے اسیر کر کے برجستگی اور برمحل الفاظ کے استعمال سے وسیع کرنے کی مہم سر کی ہے۔ "برہنہ ٹہنی بدست گلچیں تمام انگوں سے کانپتی ہے" کے معنوی جہات پر پورا ایک مضمون لکھا جا سکتا ہے اور کرن کا زیور کا لوٹنا اور ہوا کا لباس اتارنا ایسے عوامل ہیں جو زندگی کی بہت سے پیچیدگیوں کو آشکار کرتے ہیں۔ اسی طرح 'رسول تخیل' میں رسول کا استعمال قطعی نیا ہے۔ یہاں بس اعتدال پر زور صرف کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ 'رسول' تخیل کے لئے الفاظ تو ضروری ہیں لیکن بیان کے توازن کے ساتھ اور اگر یہ توازن وتناسب نہ ہوتو پھر آواز کا جل جانا لازمی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایک المیہ ہے اور اس المیے میں تخیل الفاظ کے استعمال خاص کی بوطیقا کو سامنے لانے کی صورت پیدا کی گئی ہے۔

اب حالات حاضرہ پر غور کیجئے خصوصاً مسلمانوں کے حوالے سے تو اس ذیل میں ظہیر صدیقی اس طرح تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں:

ہم تو اریخ کے زریں اوراق میں
متن پہلے تھے اب حاشیہ ہو گئے

یہ المناک پہلو ایک سچائی ہے جو شعری اظہار بن کر آئینہ دکھا رہی ہے لہذا:

کشتیوں میں ہی جاے اماں دیکھ کر
نا شناور جو تھے ناخدا ہوگئے
کارواں تو سبک سیر تھا، کیا کہیں
جو سبک سر تھے وہ رہنما ہوگئے

یہ بدلتے ہوئے حالات کی شناخت ہے اور ان کا تجزیہ بھی۔ میں قبل اس کے کہ چند دوسری باتوں کی طرف توجہ کروں، ایک غزل سے آشنا کرنا چاہتا ہوں جس کی ردیف ہے "جوں کی توں ہے" اس کے چند اشعار دیکھئے:

آگ اور آنسو لافانی ہیں اندر باہر جوں کا توں ہے
سورج سارا پانی پی کے پھر بھی ساگر جوں کا توں ہے

خوں کے چھینٹے دیواروں پر دل دہلانے والا منظر
لوہے کی میخوں میں اٹکا نازک پنجر جوں کا توں ہے
خاکستر سیندر کی عظمت ایندھن ہوتی کوکھی دولت
چپ ٹھہری، پھیلی آنکھوں میں سارا منظر جوں کا توں ہے
بن پتوں کی ڈالی نیچے راہی بیٹھا آنکھیں میچے
یہ کیسا ستانا بھائی سورج سر پر جوں کا توں ہے
میرے پیچھے آنے والو اور اندھیرا لانے والو
میں بھی کترا کر نکلا ہوں حائل پتھر جوں کا توں ہے
صدیقی تو سچ بولے گا سب کی سب باتیں کھولے گا
ہنسا کے خوگر دامن میں خونیں خنجر جوں کا توں ہے

پہلے شعر سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کچھ الوہی صفات بیان کر رہا ہے لیکن جیسے جیسے دوسرے اشعار سامنے آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ آج کے فسادات کا جو منظر نامہ ہے وہ اس پوری غزل کا قوام ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اور نہ وضاحت کی ضرورت ہے۔ ایسے احساسات ظہیر صدیقی کے یہاں بھی کئی جگہ ابھریں ہیں جن کی تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

نذر شاد عظیم آبادی سے متعلق غزلیں بھی اپنا خاص تیور رکھتی ہیں جو مجموعہ کے مطالعے سے ظاہر ہوسکتا ہے۔

اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور خاصی تعداد میں۔ میں چند نظموں کے عنوانات کی طرف آپ کے ذہن کو مائل کرنا چاہتا ہوں۔ 'استحصال'، 'حصول کل اور ایک منظر'، 'عصا بدست اب نہیں ہے کوئی' (اسرائیل، مصر جنگ میں کرنل ناصر کے نعرہ ہم بیٹے فرعون کے سے متاثر ہو کر) قتیج لمحوں کا دیوتا'...... کہ دائروں سے مفر نہیں ہے، ہیں خواب میں ہنوز......'، زمین کے درد و غم کو سمجھو (بوہمینوں Bohemians سے خطاب)، جنگ پر زور نہیں۔

یہ سب نظمیں ایک جہت نہیں رکھتی بلکہ سبھوں میں آج کے مسائل منظوم کئے گئے ہیں اور وہ بھی بڑے سلیقے کے ساتھ، شاعر نہ تو چیختا ہے اور نہ اس خراش کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو دل گرفتہ ہو،

لیکن عمل بیداری کے ظہور کی شعوری کوشش ضرور کرتا ہے لہجے کی تازگی تندی میں نہیں بدلتی بلکہ ایک ایسا اشاریہ بنتی ہے جس سے نئے طور پر جینے کا سبق ملتا ہے اور کمزوریوں سے نجات حاصل کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ مثالوں کی ضرورت نہیں۔

میرے خیال میں 'روشن ورق ورق' غزلوں اور نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی طرف ذی علم نقادوں کی توجہ ہونی چاہئے۔ خصوصاً ان نقادوں کی جوفن کاروں کی عظمت متعین کرتے ہیں۔ اور اسی زاویے سے ان کے دوسرے مجموعوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ ظہیر صدیقی ایسے شاعر نہیں جن کی نظموں اور غزلوں سے سرسری طور پر گزرا جائے، ان کا کلام سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے جس میں تجزیاتی عمل ہو، میں نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس کا انداز بھی ویسا نہیں ہے جس کا مطالبہ ان کا کلام کر رہا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو پھر اس کی طرف لوٹوں گا، کب کہہ نہیں سکتا۔

❋ ❋ ❋

غزلیں

ظہیر صدیقی

زخم تازہ برگ گل میں منتقل ہوتے گئے
پنجہ سفاک میں خنجر خجل ہوتے گئے

دید کے قابل تھا ان صحرا نوردوں کا جنوں
منزلیں ملتی گئیں ہم مضمحل ہوتے گئے

نور کا رشتہ سواد جسم سے کٹتا گیا
ہم بھی آخر باد و آتش، آب و گل ہوتے گئے

خون میں اونچے چناروں کے نہ حدت آسکی
یوں بظاہر سبز پتے مشتعل ہوتے گئے

دل کے دفتر میں تھا جذبوں کا تقرر عارضی
ہاں! جو ان میں معتبر تھے مستقل ہوتے گئے

جیسے جیسے آگہی بڑھتی گئی ویسے ظہیر
ذہن و دل اک دوسرے سے منفصل ہوتے گئے

گزری ہے عمر جبہ و دستار دیکھتے
کھلتا قبا کا بند تو زنار دیکھتے

سب مطمئن ہیں دیکھ کے تزئین بام و در
جب دیکھنا ہی تھا پس دیوار دیکھتے

سہمے ہوؤں کے بیچ ہماری نہیں شناخت
پہچاننا تھا ہم کو سر دار دیکھتے

کوشش - کہ چپے چپے پہ دیوار ہو کھڑی
خواہش- کہ بستیوں کو شجر دار دیکھتے

کس منہ سے اپنی خوبیاں کرتے بیان ہم
کس آنکھ سے خرابی اغیار دیکھتے

تسبیح عشق میں ہوں گتھے جن کے دل ظہیر
اے کاش ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھتے

✠ ✠ ✠

غزلیں

ظہیر صدیقی

حسن مژگاں نے مرے خوں کے سہارے ہی لئے
قطرہ قطرہ مری شریانوں سے سارے ہی لئے

چیختے لفظ بھی کشکول صدا میں تھے مگر
وضع اظہار نے مبہم سے اشارے ہی لئے

چاند سورج بھی تھے خوابوں کے افق پر لیکن
چشم بیدار نے پلکوں پہ ستارے ہی لئے

ٹوٹ جائے گا تو نقصان تمہارا ہو گا
مرے پہلو میں کھلونا ہے تمہارے ہی لئے

لفلک شوق نے بازار تمنا سے پھر
حسرتوں کے کئی رنگین غبارے ہی لئے

رات جیسی ہی تھی وہ ہم نے ہی گزاری ہے ظہیر
صبح اب جیسی بھی ہو ، ہوگی ہمارے ہی لئے

ہر گھڑی اپنی ہتھیلی پہ لئے جان رہے
دشمنوں میں بھی رہے ہم تو بصد شان رہے

موسم ابر میں کچھ اور ہے لطف مہتاب
شرط لیکن ہے ذرا ابر پریشاں نہ رہے

جس سے شکوہ تھا وہی کرسی انصاف میں تھا
ہم کٹہرے میں کھڑے ششدر و حیران رہے

ہاں! خلا میں بھی ہے امکان رہائش لیکن
اپنی دھرتی پہ تو سکھ چین سے انسان رہے

عمر بھر دشت نوردی رہی عادت اپنی
شہر میں رہ کے بھی ہم چاک گریبان رہے

ایک اک دل میں ہیں پیدا کئی طوفان، ظہیر
کاش ہر دل میں کوئی ایک ہی طوفان رہے

✠✠✠

غزلیں

ظہیر صدیقی

ہمکتی جھومتی فصلوں کو پھر ستائے گی
سلگتی ریت گھٹاؤں کو ورغلائے گی
خود آکے چھیڑ کرے گی ہوا درختوں سے
دبوچ لیں گی جو شاخیں تو کسمسائے گی
ہزار سیر شکم ہو یہ لالچی دھرتی
لہو کی بوند اسے پھر بھی آزمائے گی
اڑان جتنی ہو اونچی ، کبوتری آخر
غذا کے واسطے سطح زمیں پہ آئے گی
قبیلہ ، قوم بناتی ہوئی یہ آبادی
پھرایک بار گپھاؤں میں لوٹ جائے گی
ظہیر ،تیزجو ہوگی یہ عمر کی آندھی
کتاب زیست کے سارے ورق اڑائے گی

بے برگ وبار راہ میں سوکھے درخت تھے
منزل تہ قدم ہوئی ہم تیز بخت تھے
حملے چہار سمت سے ہم پر ہوئے ، مگر
اندر سے وار جتنے ہوئے اور سخت تھے
تھے پیڑ پر تو مجھ کو بہت خوش نما لگے
توڑے تو جتنے پھل تھے کسیلے کرخت تھے
سوئے تو یاد قوس قزح میں سمٹ گئی
جاگے تو جتنے رنگ تھے وہ لخت لخت تھے
سر تو چھپائیں کوئی کرایہ کی چھت ملے
یوں اس قدم کی زد میں کبھی تاج وتخت تھے
اس کے کرم نے کردیاآساں سفر،ظہیر
تحویل میں ہماری گراں گیر رخت تھے

✠ ✠ ✠

غزلیں

ظہیر صدیقی

ہر گل تازہ ہمارے ہاتھ پر بیعت کرے
اس کی زلفوں تک پہنچنے کے لئے منت کرے
دل بچائے یا سراہے آتش رخسار کو
جس کا گھر جلتا ہو وہ شعلوں کی کیا مدحت کرے
آم کے پھولوں کو خود ہی جھاڑ دے اور اسکے بعد
بے ثمر شاخوں سے آوارہ ہوا حجت کرے
شہر والوں کو بھی حاجت ہے اناجوں کی ،مگر
خوش لباسی موسم برسات پر لعنت کرے
یوں بہانے سے چھپالو اپنے اشکوں کو ،مگر
آنکھ کی سرخی دل پر درد کی غیبت کرے
خون کے دو چار قطرے دل میں ہیں باقی ظہیر
دشنہ مژگاں سے کہہ دو اک ذرا زحمت کرے

وہ ساحل حریص کی پلکیں بھگو گئے
موتی اچھال کر جو تہہ آب سو گئے
ماتم گسار لاش پہ اس طرح رو گئے
قاتل کی انگلیوں کے نشانات دھو گئے
اشکوں سے سینچتے رہے اشجار بے ثمر
اسلاف کشت ذہن میں وہ بیج بو گئے
روشن ورق ورق ہے،منور چراغ ہے
ہم ہی کھلی کتاب پہ سر رکھ کے سو گئے
خوابوں میں جھاگ ابھرتے رہے آفتاب کے
دریائے شب میں نور سحر وہ بلو گئے
ایسے شناوروں سے ہوا سابقہ ظہیر
ڈوبے خود آپ اور ہمیں بھی ڈبو گئے

✠✠✠

غزلیں

ظہیر صدیقی

نوک زباں ہے کند مگر آنکھ تر تو ہو
یوں احتجاج ہو کہ اسے کچھ خبر تو ہو
مڑ مڑ کے دیکھنے کے عمل سے مفر تو ہو
الجھن سفر سے پہلے ذرا مختصر تو ہو
سب جانتے ہیں صبح میں نکلے گا آفتاب
فی الحال مسئلہ ہے کہ یہ شب بسر تو ہو
یہ شہر آسرا نہیں دیتا تو کیا گلہ
اے دوست اپنے گاؤں میں ایک اپنا گھر تو ہو
خاروں سے چھینتے چلیں ہر تار پیرہن
منزل طلب کرے تو ثبوت سفر تو ہو
دریائے غم کی تہہ سے اچھالیں گے ہم ظہیر
ان آنسوؤں کا ایک بھی قطرہ گہر تو ہو

اپنا یہ عزم جنگ ہی زیب ہدف نہ ہو
دشمن بھی میری طرح کہیں سربکف نہ ہو
مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں کہ کچھ چھوٹتا نہ ہو
اس کشمکش میں قصد سفر برطرف نہ ہو
وہ آدمی سہی ، پسر نوح تو نہیں؟
وہ سگ سہی، کہیں سگ غار کہف نہ ہو
تشہیر کی ہوس نہیں ، ورنہ یہ کب ہوا
دروازۂ خیال پہ لفظوں کی صف نہ ہو
اب سر بہ مہر کیجئے شب کی دوات کو
پھر نقشہ طلوع سحر ہی تلف نہ ہو
گفتار، چال ڈھال میں جدت تو ہے، ظہیر
کوشش کریں لہو میں بھی رنگ سلف نہ ہو

✠✠✠

رباعیاں

وہاب اشرفی کے نام

سلطان اختر

افکار ادب نقد و نظر کا قصہ
صد رشک سخن زار ہنر کا قصہ
اختر ورق دل سے نہیں اٹھ سکتا
وہاب کے بے سمت سفر کا قصہ

○

ہر سو ادبستاں میں تری خوشبو ہے
سر چڑھ کے جو بولے تو وہی جادو ہے
تحسین سے بالا سخن تازہ ترا
شہکار یہ 'تاریخ ادب اردو' ہے

○

گلدستۂ صد رشک چمن ہے وہاب
شائستۂ تہذیب کہن ہے وہاب
اختر بھی ارباب ادب کہتے ہیں
اس عہد کا معیار سخن ہے وہاب

○

سجتا ہے بہت روز ہی بازار ادب
آتے ہیں مگر کتنے خریدار ادب
جو خود کو ادب کیلئے گروی رکھ دے
وہاب سا دیکھا نہ طلبگار ادب

○

سرشار ہیں موجوں کی روانی کی طرح
بازو میں ابھی زور جوانی کی طرح
ناقد بھی ،محقق بھی ہیں وہاب مگر
غزلیں بھی کہا کرتے ہیں پانی کی طرح

○

افکار و خیالات وذہانت کو سلام
تیرے سخن و علم و ریاضت کو سلام
دیکھا نہ سنا تجھ سا طرح دار ادب
وہاب ترے فن تری عظمت کو سلام

✠ ✠ ✠

ساجدہ زیدی

میں تیرے دربار میں لب کشا ہوں

تری رحمت نے میری روح کو
......جو نعمتیں دی تھیں

شراب عشق سے
جام طلب لبریز رکھا تھا
متاع آرزو سے......
خانہ دل کیسا محشر خیز رکھا تھا
مجھے ذرہ بنا کر
''حرف کن'' کی پاسداری دی
مرے قطرے کو
بحر بیکراں کی بے قراری دی،

مرے دل کے نہاں خانے میں لرزاں
نالۂ پر جوش تھا......
باطن کے غم خانے میں رقصاں
نغمۂ خاموش تھا......
سب تری رحمت تھی......
سفینۂ غم کا......
دریائے محبت میں ڈبو دینے کی مہلت تھی

دل ناسودہ کو تو نے عجب سی نعمتیں دی تھیں
مجھے فطرت سے......
ہم آغوشیوں کی راحتیں دی تھیں
گلوں سے،
خوشبوؤں سے
طائروں کی دل نشیں پرواز سے
بارش کی بوندوں سے
پربتوں سے
سرو کے پتوں، صنوبر کی لچکتی ڈالیوں سے
جاگتے صحرا کی آوارہ ہواؤں سے......
سرشام وسحر
سرگوشیوں کی لذتیں دی تھیں

خدائے لم یزل
وہ بخششیں تیری کہاں ہیں

یہ
طلسم ایں وآں کیا ہے......؟
دیار دل سے......
پہنائے افق تک......
یہ سکوت بیکراں کیا ہے......؟؟

ساجدہ زیدی

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

مگر جسموں سے جب
روحوں کی بیتابی نکل جائے
ہوائیں بند ہو جائیں
فضائیں کہر کی چادر میں منہ ڈھک لیں
دمکتے سبزہ زاروں میں
فقط کانٹے اگیں......
مٹی کی خوشبو
آسماں کا رنگ مٹ جائے
طیور خوش لحن خاموش ہو جائیں،
دل شاعر کے نغمے گنگ ہو جائیں،
زمانہ ایسی کروٹ لے
کہ خواب زندگانی طائر محبوس ہو جائے
کوئی ایسی گھڑی آئے......
صدائے نالہ دل بے پر پرواز ہو جائے
جب انساں خود سے،
اپنے رب سے،
اپنے درد سے بیگانہ ہو جائے
تو پھر یہ عاشقان جرعۂ ہستی کہاں جائیں......؟
یہ سب رندان بزم عشق و سرمستی کہاں جائیں......؟

✠ ✠ ✠

اختتام سفر ہے

اختتام سفر ہے......
عجب رہ گزر ہے......
وجود و عدم کی یہ مبہم کہانی
جو قرطاس ہستی پہ
پھیلی ہوئی ہے......
فراز کہستاں،
نشیب زمانہ کی
اس پر خطر داستاں کا
بس اک گوشہ مختصر ہے......
اختتام سفر
ایک گام سفر ہے

✠ ✠ ✠

ظہیر صدیقی

زمین کے درد و غم کو سمجھو

(بوہیمنیوں [BOHEMIANS] سے خطاب)

تمہیں ہے شکوہ
کہ دشت و صحرا کی وسعتوں کو
امستِ دیوار در نے محبوس کرلیا ہے
فلک کو چھوتے ہوئے پہاڑوں
کے آبشاروں کی نغمگی چیخ بن گئی ہے
یہ مانتے ہو
کہ ان گنت نظریوں کی بے جا قبولیت نے
سکونِ قلب و نظر گنوایا
کہ منزلوں کے سبھی تصور
سبھی زمانے میں وہم فکر و نظر رہے ہیں
سکون کی جستجو تو بیوہ کی چوڑیوں کی طرح
فقط خام دائرے ہی بنا سکی ہے
مقید افراد کی اکائی
معاشرہ توڑتا رہا ہے

بقول ایمرسن
"سماج اک موج کی طرح ہے
یہ موج بڑھتی رہی ہے آگے
مگر وہ پانی کہ جس سے بنتی ہے موج
بڑھتا کبھی نہیں ہے"
یہ سوچتے ہو
ہوس کے ناخن نے جارحانہ خراشیں دے کر
عظیم دھرتی کے ایک سینے کو
سرحدوں میں بدل دیا ہے
تمہاری خفگی بجا ہے، لیکن
میں سوچتا ہوں
کہ ساری قدروں سے منحرف ہو کے
تم کہاں ہو ـــــ ؟
بنالیا ہے جو تم نے

کچھ سرپھروں کا جتھا
تو آخر کار تم کو یہ ماننا پڑے گا
معاشرہ سے مفر نہیں ہے

[۲]

وسیع دریا کے صاف سینے پہ
کشتیوں کے جلوس کی طرح
آسماں میں
بظاہر اُ ہر اصول سے بے نیاز
چڑیوں کا غول اک سمت بہہ رہا ہے
اسے بھی آخر زمیں کی جانب ہی لوٹنا ہے
کہ شام ہوتے ہی

سر چھپانے کے واسطے
اس زمین پر ہی اگے درختوں کو
چومنا ہے
ہماری پرواز منت بال و پر رہی ہے
ہماری ہر نفی سوئے اثبات ہی گئی ہے
تو اس سے پہلے کہ بے اصولی
اصول بن جائے
آؤ فکر و نظر کی تطہیر کے لئے تم
خلا سے اترو
زمین کے درد و غم کو سمجھو

✠ ✠ ✠

جمال اویسی

ہیئت کی تلاش

میں اپنی اک نظم میں کھو گیا
مجھے ڈھونڈتے کتنے آئے گئے
کوئی میری صورت بنا کر گیا
کوئی ماہیئت میں الجھ کر رہا
میں کس عہد میں تھا یہ پوچھا گیا
مگر عہد کا کچھ پتہ نہ چلا
مرے چاروں سمت ایک دیوار اٹھی
دریچے بنائے گئے اور در
زمیں پختہ کی چھت بھی ڈھالی گئی
یہ سمجھا گیا اب میں ظاہر ہوا
مگر مسئلہ جوں کا توں ہی رہا

وہ ہیئت ہو یا کوئی صورت جسے
بڑی کاوشوں سے بنایا گیا
نہیں میل کھاتی مری ذات سے
مرا کوئی چہرہ نہیں دوستو
مجھے ڈھونڈنا تم مری نظم میں
جو تم کو سمجھ میں اگر آگئی
تو ہیئت بھی سمجھو مری پا گئے
مگر اس کو کاغذ پہ لانا نہ تم
زمانہ کو چہرہ دکھانا نہ تم
میں اک غیرمرئی خداداد شئے
زمانے کی دریافت سے دور ہوں

✠✠✠

جمال اویسی

مرگ انسان کا جشن

چلو انسان مر گیا آخر
ناک میں دم کیا تھا موذی نے
ہر قدم اک سوال تھا جس کا
لفظ نشتر تھے دل میں چبھتے تھے
نظر ایسی کہ چیر جاتی تھی
چلو انسان مر گیا آخر
زندہ ہوتا تو گفتگو کرتا
زندگی کے معاملات پہ جب
خنجر اپنی زباں پہ رکھ دیتا
اور کہتا کہ حق ہی کہنا ہے
اس کے بدلے میں جاں ہی کیوں نہ جائے
چلو انساں کے مرنے سے ہم کو
یہ سہولت تو مل گئی آخر

رات کو دن بنائے رکھتے ہیں
چلو اچھا ہوا کہ یہ انساں
فکر و تہذیب کا پٹارہ تھا
بولنے کے علاوہ اس کو بھی
کام ڈھب کا نہ کوئی آتا تھا
آج ہر سو خموش ہے دنیا
اس کے مرنے سے ہے سکوں ہر جا

✠ ✠ ✠

نعمان شوق

کارنامہ

میں تو
بس جھنجھلانا، غصہ کرنا
اور چیخنا چاہتا ہوں
مجھ سے مت پوچھو
میرے کارناموں کے بارے میں

میں
کوئی وزیر، اداکار
یا کرکٹ اسٹار نہیں
مجھے اقرار ہے
میں نے کوئی تحقیق نہیں کی
مجھے یقین ہے
کوئی میزائیل، کوئی بم
نہیں بنایا میں نے
یہاں تک کہ
کسی ناشر نے نہیں چھاپی
میری کوئی کتاب بھی

ہاں!
دیکھا ہے میں نے
ایک سہمی ہوئی عورت سے چھین کر
سال بھر کے بچے کو
آگ میں جھونکے جاتے ہوئے
لیکن
دوسرے تماش بینوں کی طرح
سو نہیں گیا میں
اپنے ضمیر کا تکیہ بنا کر
بلکہ چیختا رہا
چیختا رہا
اگر
تم جاگ رہے ہو
تو میری چیخ ہی
میرا سب سے بڑا کارنامہ ہے

✠✠✠

غزل ہے شرط

(غزلوں کے منتخب اشعار)

شہریار

[۱]

امید سے کم چشم خریدار میں آئے
ہم لوگ ذرا دیر سے بازار میں آئے

[۲]

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

[۳]

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گزرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

[۴]

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے
حدنگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے

[۵]

نہ جس کی شکل ہے کوئی نہ جسکا نام ہے کوئی
اک ایسی شئے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

[۶]

بہانہ مل گیا اس کو ترے تغافل کا
وگرنہ دل کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی

[۷]

کوئی ہے جو ہمیں دو چار پل کو اپنا لے زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے

[۸]

عمر بھر دیکھا کئے اس کی طرف یوں جیسے سارے عالم کی حقیقت نگہ یار میں ہے

[۹]

لاکھ خورشید سربام اگر ہیں تو رہیں ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

[۱۰]

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائینگے

[۱۱]

عجیب سانحہ مجھ پرگزر گیا یارو میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

[۱۲]

وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اسے سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

[۱۳]

جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے

[۱۴]

تجھ سے بچھڑے ہیں تو اب کس سے ملاتی ہے ہمیں زندگی دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے ہمیں

[۱۵]

مرکز دیدہ و دل تیرا تصور تھا کبھی آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

[۱۶]

گردش وقت کا کتنا بڑا احساں ہے کہ آج یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

[۱۷]

جدھر اندھیرا ہے تنہائی ہے اداسی ہے سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

[۱۸]

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آ گیا

[۱۹]

اس حادثے کو سن کے کرے گا یقیں کوئی سورج کو ایک جھونکا ہوا کا اڑا گیا

[۲۰]
جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

[۲۱]
دو چار پل سکون سے ہم بھی گزار لیں
اس دشت بیکراں میں کوئی گھر نظر تو آئے

[۲۲]
آندھیاں آتی تھیں لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
خوف کے مارے جدا شاخ سے پتہ نہ ہوا

[۲۳]
وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

[۲۴]
دل پریشاں ہو مگر آنکھ میں حیرانی نہ ہو
خواب دیکھو کہ حقیقت سے پشیمانی نہ ہو

[۲۵]
سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

[۲۶]
ہجوم دیکھتا ہوں جب تو کانپ اٹھتا ہوں
اگرچہ خوف نہیں اب کسی کے کھونے کا

[۲۷]
کار دنیا سے فرو مایہ محبت نکلی
اہل دل میں بھی بہت جینے کی حسرت نکلی

[۲۸]
پاس کی چیزوں پہ دوری کے دھند لکے چھائے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کی صورت نکلی

[۲۹]
طویل ہونے لگی ہیں اسی لئے راتیں
کہ لوگ سنتے سناتے نہیں کہانی بھی

[۳۰]
حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

[۳۱]
پہلے نہائی اوس میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اتری ہمارے گھروں میں رات

[۳۲]
آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیئے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

[۳۳]

عذاب کوئی بھی تنہائیوں کا سہہ نہ سکا ہر ایک شخص نے اک انجمن بنالی ہے

[۳۴]

دل میں اترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے نوک خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے

[۳۵]

جمع کرتے رہے اپنے کو جو ذرہ ذرہ وہ یہ کیا جانیں بکھرنے میں سکوں کتنا ہے

[۳۶]

ایسے ہجر کے موسم کب کب آتے ہیں تیرے علاوہ یاد ہمیں سب آتے ہیں

[۳۷]

ایسے ہجر کے موسم کب کب آتے ہیں تیرے علاوہ یاد ہمیں سب آتے ہیں

[۳۸]

کاغذ کی کشتی میں دریا پار کیا دیکھو ہم کو کیا کیا کرتب آتے ہیں

[۳۹]

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

[۴۰]

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہوسکتی ہے اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

[۴۱]

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے ترے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے

[۴۲]

میں اپنے جسم کی سرگوشیوں کو سنتا ہوں ترے وصال کی ساعت نکلتی جاتی ہے

[۴۳]

بام و در کی قید سے مجھ کو رہا کس نے کیا دشت کی وسعت کے حق میں فیصلہ کس نے کیا

[۴۴]

عشق کہئے کہ ہوس اس کی بدولت کچھ ہے راکھ کے ڈھیر میں چنگاری کی صورت کچھ ہے

[۴۵]

آج کی رات سے گھوموں گا کھلی سڑکوں پر آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے

[۴۶]

یہ جب ہے کہ اک خواب سے رشتہ ہے ہمارا — دن ڈھلتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے ہمارا

[۴۷]

پہلے تجھے دیکھا تھا پرچھائیں کی صورت میں — پھر جسم ترا میری رگ رگ میں اتر آیا

[۴۸]

سیاہ رات نہیں لیتی نام ڈھلنے کا — یہی تو وقت ہے سورج ترے نکلنے کا

[۴۹]

ہر قدم پہ موڑ تھے ہر موڑ پہ منظر نئے — عمر کی اک ایک ساعت صرف حیرانی ہوئی

[۵۰]

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں — حاصل سیر جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

✠ ✠ ✠

غزل

محمد سالم

(شمس الرحمٰن فاروقی کی نذر)

آرزو کو اجال کر رکھنا
حسرت دل نکال کر رکھنا
ریت ہی ریت ہے نگاہوں میں
بس جنوں کو سنبھال کر رکھنا
تیرا آئینہ ہے غبار آلود
دل کو اپنے کھنگال کر رکھنا
رات کٹتی نہیں جو فرقت میں
شب غم کو اجال کر رکھنا
دیکھو ہر لحہ وار کا ہے خوف
تم بھی پتھر اچھال کر رکھنا
دیکھو گے اس کو ایک مدت پر
خود کو سالم سنبھال کر رکھنا

You have to shine your wish in the heart
Fulfill your wishes in this manner
Sand only sand in singhts everywhere
Your've to keep safe only your madness
your mirror of heart is full of dust
And you have to make it free from grief
If the night doesn't pass in detachment
You have to brighten the agony's night
At all times is a fear of attack
You too be alert showing up stones
Yoy will see him after a long time
O Salim! you would control yourself

✠ ✠ ✠

(Translated by the author)

غزل

محمد سالم

(وہاب اشرفی کی نذر)

English	اردو
My life has passed in love affair	زندگی عاشقی میں گزری ہے
And those years have gone by in regrets	حسرتوں میں یہ عمر بیتی ہے
How I tell you my heart's condition	کیا سناؤں میں حال دل اپنا
I have always seen disappointment	نامرادی مدام دیکھی ہے
In this age of the faithlessness now	بے وفائی کے عہد میں اب تو
The past's memory is comforter	یاد ایام غم کی ساتھی ہے
My poems are impressive in which	شعر میرے ہیں پراثر جن میں
I've described the details of sorrow	غم کی روداد میں نے کہہ دی ہے
I have thought of Him,I have loved Him	اس کو سوچا ہے اس کو چاہا ہے
In midnight bowing head I've worshipped	نیم شب سرنگوں دعا دی ہے
O Salim! darkness is all around	تیرگی ہے چہار سو سالم
The candle of wish is still lighting	پر تمنا کی شمع جلتی ہے

(Translated by the author

غزلیں

ظفر گورکھپوری

دل پر خوں غم اس کا نکلا
آبلہ توڑ کے کانٹا نکلا
کیا خیال آیا ڈبو دینے کے بعد؟
شہر کی کھوج میں دریا نکلا
دل میں لگتا ہے کئی مقتل تھے
خوں توقع سے زیادہ نکلا
کیسے کہہ دوں کہ سکوں واپس کر
چور برسوں کا شناسا نکلا
کوئی دستک ، کوئی دیوار ، نہ در
گھر بھی میری طرح تنہا نکلا
دل میں کیا قطرۂ خوں تک بھی نہ تھا
تیر کیوں سینے سے پیاسا نکلا
پیڑ اتنا کبھی مغموم نہ تھا
کس مسافت پہ پرندہ نکلا
دل کو یوں تو کئی رنگوں نے چھوا
اک ترا رنگ ہی گہرا نکلا
کل بھی نکلا تھا ظفر دل سے دھواں
اب کے موسم میں زیادہ نکلا

یاں اپنی سی ہم نے بسر اوقات کہاں کی
دنیا سے ملے ، خود سے ملاقات کہاں کی
دل شہر تھا، سب شہر کی جگمگ میں ہوئیں گم
یادوں نے تری سیر مضافات کہاں کی
غم، جانہ ابھی دل سے کہ دل میں ہے بہت خون
ہم نے تری جی بھر کے مدارات کہاں کی؟
دریا کو بھلا کون سی پانی کی کمی تھی
ابر آیا ، مگر ابر نے برسات کہاں کی؟
اے شہر نگاراں کی ہوا پوچھ تو اک بار
دن ہم نے گزارا ہے کہاں، رات کہاں کی
یاد آیا نہیں عمر رواں کو بھی کچھ اب تک
ہم نے بھی حسابوں کی شروعات کہاں کی
پھر کیسے ظفر اس نے مرا جان لیا حال
بس ایک ذرا ہونٹ ہلے ،بات کہاں کی

✠✠✠

غزلیں

رؤف خیر

شرطوں پہ اپنی کھیلنے والے تو ہیں وہی
مہرے "سفید گھر" میں بھی کالے تو ہیں وہی

شاخوں پہ سانپ ہیں تو شکاری ہیں تاک میں
سہمے پرندے ان کے نوالے تو ہیں وہی

پہچاننے میں ہم کو تکلف ہوا انہیں
حالانکہ اپنے جاننے والے تو ہیں وہی

وارث بدل گئے کہ وصیت بدل گئی
لیکن گواہ اور قبالے تو ہیں وہی

اب ان پہ انگلیوں کے نشانات اور ہیں
ہرچند اپنے قتل کے آلے تو ہیں وہی

کھلواڑ کر رہے تھے جو ہم سے وہ کھل گئے
یہ اور بات حیلے حوالے تو ہیں وہی

ساری حیات جن کی اندھیرے میں کٹ گئی
اندھیر ہے کہ خیر جیالے تو ہیں وہی

تمہارے نام کا پردہ کہاں اٹھاتی ہے
اسی جگہ تو کہانی بدن چراتی ہے

ادھر ادھر کو بھٹکنے کبھی نہیں دیتی
وہ بوئے خوش بدنی راستہ دکھاتی ہے

خطاوہیں سے تو اندھے کے تیر ہوتے ہیں
جہاں سے نیک گمانی فریب کھاتی ہے

یہ لوٹنا ہے کہ لٹنا ہے کہہ نہیں سکتے
خدا گواہ ترا حسن سومناتی ہے

غلط سلط بھی کبھی فیصلے ہوئے ہم سے
مزاج اپنا ذرا غیر تجزیاتی ہے

کسی طرح سے سہی دن گزر ہی جاتا ہے
مگر وہ رات کہ جب نیند ٹوٹ جاتی ہے

انا کے ہاتھ میں تلوار ہے جو دو دھاری
کبھی کبھی تو خود اپنا لہو بہاتی ہے

کوئی کتاب ہو بین السطور ہی پڑھئے
یہ راکھ وہ ہے جہاں آگ منہ چھپاتی ہے

کسی طرح تو کرائے کی علتوں سے بچے
نواح شہر میں اک گھر تو خیر ذاتی ہے

✠✠✠

غزلیں

عالم خورشید

قربتوں کے بیچ جیسے فاصلہ رہنے لگے
یوں کسی کے ساتھ رہ کر ہم جدا رہنے لگے
کس توقع پر کسی سے آشنائی کیجیے
آشنا چہرے بھی تو نا آشنا رہنے لگے
دستکیں خالی مکانوں سے پلٹ آتی ہیں اب
کیا پتہ کس شہر میں اہل وفا رہنے لگے
رنگ و روغن بام و در کے اڑ ہی جاتے ہیں میاں
جب کسی کے گھر میں کوئی دوسرا رہنے لگے
عشق کی لذت ذرا اس کے مکیں سے پوچھیے
ہر گھڑی جس گھر کا دروازہ کھلا رہنے لگے
ایک مدت سے مقفل ہے مرے دل کا مکاں
عین ممکن ہے یہاں کوئی بلا رہنے لگے
عشق کی تہذیب کے ہیں اور ہی کچھ فلسفے
تجھ سے ہو کر ہم خفا، خود سے خفا رہنے لگے
آسماں سے چاند اترے گا بھلا کس خاک پر
تم بھی عالم واہموں میں مبتلا رہنے لگے

تھپک تھپک کے جنہیں ہم سلاتے رہتے ہیں
وہ خواب ہم کو ہمیشہ جگاتے رہتے ہیں
امیدیں جاگتی رہتی ہیں، سوتی رہتی ہیں
دریچے شمع جلاتے بجھاتے رہتے ہیں
نہ جانے کس کا ہمیں انتظار رہتا ہے
کہ بام و در کو ہمیشہ سجاتے رہتے ہیں
کسی کو ڈھونڈتے ہیں ہم کسی کے پیکر میں
کسی کا چہرہ کسی سے ملاتے رہتے ہیں
وہ نقش خواب مکمل کبھی نہیں ہوتا
تمام عمر جسے ہم بناتے رہتے ہیں
اسی کا عکس ہر اک رنگ میں جھلکتا ہے
وہ ایک درد جسے سب چھپاتے رہتے ہیں
ہمیں خبر ہے کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
گئے دنوں کو مگر ہم بلاتے رہتے ہیں
یہ کھیل صرف تمہیں کھیلتے نہیں عالم
سبھی خلا میں لکیریں بناتے رہتے ہیں

⊕⊕⊕

غزلیں

راشد انور راشد

بھٹکتا رہتا ہے کیوں بے قرار جنگل میں
بچھڑنے والے کو پھر سے پکار جنگل میں
درخت سوکھ گئے تھے چہار سمت ، مگر
غضب کے پھول کھلے بے شمار جنگل میں
نہ جانے کوئی بھی گلشن کی سمت شور اٹھا
کہ اب منائیں گے جشن بہار جنگل میں
جماعتوں کی جو وحشت اسے ستائے گی
پلٹ کے آئے گا بے اختیار جنگل میں
خدا کے واسطے جانے دو ، کر رہا ہے کوئی
کئی یگوں سے مرا انتظار جنگل میں
ذرا سا شعلہ بھی ابھرا تھا پھر تو اگلے پل
تمام پھیل گیا انتشار جنگل میں
اگر شکاری نہیں ہے تو کس لئے آخر
دکھائی دیتا ہے وہ بار بار جنگل میں

ہٹائے ہٹتا نہیں ہے وجود کا پتھر
ہوائے دشت مرے جسم کو بنا پتھر
نہ جانے کون سی تاثیر ہے ان آنکھوں میں
کہ جس نے غور سے دیکھا مجھے ، ہوا پتھر
میں اس کی ذات کو منزل شمار کرتا ہوں
مجھے سمجھتا ہے وہ اپنی راہ کا پتھر
یہ واقعہ ہے مگر میں بیان کیسے کروں
مرے ہی سائے نے مجھ پر اٹھا لیا پتھر
اسے پتہ ہے مری شخصیت تھی موم صفت
ستم کی آگ نے لیکن بنا دیا پتھر
ہے لین دین میں مشاق وہ بہت ، لیکن
جو میں نے پھول دئے کیوں تھما دیا پتھر
کوئی بھی کام کا ہتھیار اب تو پاس نہیں
پلٹ کے دینا ہے مجھ کو جواب ، لا پتھر

✠✠✠

غزل

احمد کمال حشمی

(نذر ساقی فاروقی)

میری خواہش ہے الگ، میری طبیعت کچھ اور / مجھ سے کرواتی ہے پر میری ضرورت کچھ اور

جس کی فرقت میں ہے دیوانوں سی حالت میری / 'اسکے آجانے سے بڑھ جاتی ہے وحشت کچھ اور'

زندگی بھیس بدل لینے میں ماہر ہے بہت / جب بھی ملتی ہے تو دکھلاتی ہے صورت کچھ اور

میرے دل کی یہ تمنا ہے کہ منزل نہ ملے / تم چلو ساتھ تو بڑھ جائے مسافت کچھ اور

اپنے غم دے دے مجھے تو مری خوشیاں لے لے / تو اگر چاہے تو دے سکتا ہوں قیمت کچھ اور

وہ جو ظاہر ہے وہ باطن بھی ہو لازم تو نہیں / سجدہ کرنے کا عمل اور، عبادت کچھ اور

زندگی تیرے ہی ہاتھوں مجھے مرنا ہوگا / موت آتی ہے تو دے جاتی ہے مہلت کچھ اور

شہر میں یوں تو میں بدنام بہت تھا لیکن / میری رسوائی بڑھی تیری بدولت کچھ اور

کہتا ہے اور ہی کچھ جلتے مکانوں کا دھواں / رات کے بارے میں کہتی ہے حکومت کچھ اور

جب شناسائی سے انکار وہ کرتا ہے کمال / چپ ہی رہنے میں بھلائی ہے کھومت کچھ اور

✠✠✠

غزلیں

عبیدالرحمٰن

تخیل کی آباد کاری کریں
کہ بیدار حس ہم تمہاری کریں
خزانی ہے موسم بہاری کریں
چلو کام اب کے یہ بھاری کریں
یہی کام سب باری باری کریں
رچیں سازشیں رازداری کریں
سنے ہے نہ کوئی مگر عادتاً
وہ ہر روز فرمان جاری کریں
رفاقت ہماری مثالی بنے
ہوائے زمانہ سے یاری کریں
ہو خوشبو یہ اپنی چمن در چمن
ہواؤں پہ آؤ سواری کریں
ہے گھاٹے کا سودا اگر شاعری
عبید آپ کیوں مغز ماری کریں

گئے موسم کا نشہ کیا کرے گا
ہمارا حال اچھا کیا کرے گا
ہے جھوٹوں کا نگر لیکن پتہ ہے
یہاں پر ایک سچا کیا کرے گا
زباں تو رنگ خوں کا مانگتی ہے
یہاں چونے پہ کتھا کیا کرے گا
سپر رکھ دی سبھی نے اس کے آگے
جو کہتے تھے نہتا کیا کرے گا
ہوا کی زد پہ ڈھونڈے گا ٹھکانہ
شجر چھوٹے تو پتہ کیا کرے گا
عبید اس عہد نو میں یہ نہ کہئے
بڑوں کے بیچ بچہ کیا کرے گا

٭٭٭

غزلیں

ذکی طارق

ہم نے خود دے کے لہو خشت وفا رکھی ہے
آپ فرمائیں کہ کیا اس کی سزا رکھی ہے
وقت کی دھوپ سے پونجی یہ بچا رکھی ہے
ماں نے "پھولوں" پہ دعاؤں کی ردا رکھی ہے
شمع احساس سر فکر جلا رکھی ہے
ہم نے ہر کھڑکی سدا ذہن کی وا رکھی ہے
ہے یقیں نیند سے جاگیں گے کبھی تو منصف
ہم نے انصاف کی زنجیر ہلا رکھی ہے
خیر خواہوں کے خیالات پرکھنے کے لئے
خود ہی مرنے کی خبر میں نے اڑا رکھی ہے
میں کہ اردو کا قلمکار ہوں خوابوں کا اسیر
ذہن میں صبح کی تعبیر سجا رکھی ہے
کیوں نہ ہر طاق کھنڈر کا ہو اجالوں کا گواہ
اس نے سوغات سیاہی کی بچا رکھی ہے
ایک گھر بے در و دیوار کا کرکے تعمیر
میں نے آنگن کی کھلی آب و ہوا رکھی ہے
پاس تو رکھا ہے دیرینہ روایت کا ذکی
اپنی پہچان مگر میں نے جدا رکھی ہے

حسن ظہیر

ہر ایک بات وہ میرے خلاف کرتا ہے
عجیب شخص ہے دل میں شگاف کرتا ہے
میں اس کی بستی کا ادنیٰ چراغ ہوں لیکن
وہ روشنی سے مری انحراف کرتا ہے
حصار ذات سے باہر وہ جھانکتا ہی نہیں
وہ اندھے غار میں اپنا طواف کرتا ہے
دروغ گوئی تو شامل ہے اس کی فطرت میں
مگر وہ سچ کا بھی اب اعتراف کرتا ہے
خطائیں ہوتی ہیں سب سے مگر کرو توبہ
خدا کریم ہے سب کو معاف کرتا ہے
دعا حریف کے لب پر ہے میرے جینے کی
مرا رفیق مگر اختلاف کرتا ہے
نہ جانے مجھ سے ہے پرخاش کیا ظہیر اس کو
وہ مجھ کو دیکھ کر آنکھیں غلاف کرتا ہے

٭٭٭

غزلیں

اختر شاہجہاں پوری

مثل دریا کوئی قطرہ تو نہیں ہو سکتا
میرا سایہ کبھی مجھ سا تو نہیں ہو سکتا
چند اشکوں کی کچھ اوقات ہوا کرتی ہے
وجہ سیلاب یہ گریہ تو نہیں ہو سکتا
آئینہ دیکھتے رہنے سے ہوا کیا حاصل
پہلے جیسا کبھی چہرہ تو نہیں ہو سکتا
آسماں پر جو چمکتا ہے مہ و انجم کے ساتھ
میری قسمت کا ستارہ تو نہیں ہو سکتا
جس کی تعزیر میں جنت سے نکالے گئے ہم
وہ گنہ ہم سے دوبارہ تو نہیں ہو سکتا
میرے غم خانۂ ہستی میں اندھیرا ہے بہت
ایک جگنو سے اجالا تو نہیں ہو سکتا
کس لئے آئے ہو اس اندھے نگر میں اختر
اس جگہ کوئی تماشہ تو نہیں ہو سکتا

محبت اور وفا منشور ہے میرا
زمانہ پھر بھی کب مشکور ہے میرا
خیالوں میں سفر طے کر رہا ہوں میں
بدن پھر بھی تھکن سے چور ہے میرا
خوشی بانٹی گئی جب سے قبیلے میں
دل غم آشنا رنجور ہے میرا
تری محفل میں ہر سو رنگ و رعنائی
تو کیا خلوت کدہ بے نور ہے میرا
حصار ذات سے باہر بھی نکلے گا
ابھی ہمزاد کچھ مغرور ہے میرا
بھنور، طوفاں، تھکے بازو، شکستہ دل
کنارے سے سفینہ دور ہے میرا
اٹھائے پھر رہا ہے بار غم اختر
مرا سایہ بھی کیا مزدور ہے میرا

***

حسن نواب حسن کے منتخب اشعار

حسن نواب حسن کے مندرجہ ذیل اشعار پسند کرتے ہوئے ڈاکٹر کلیم عاجز نے کہا: ''حسن نواب حسن صاحب بھی ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات بنیں۔ آج وہ کیا ہیں، کل وہ کیا ہو جائیں گے:

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

آدمی سے دور کتنا آدمی رہ جائے گا
روز مل کر بھی یہ چہرہ اجنبی رہ جائے گا

درد رشتوں کا رہے کچھ درد رشتوں کا رہے
زندگی نبھ جائے بس یونہی تو کیا اچھا رہے

ہم تو عادی ہو چکے جینے کے ان کانٹوں کے ساتھ
تم گزارا کر سکو گے کتنے دن پھولوں کے ساتھ

مرا رب مجھ پہ کتنا مہرباں ہے
کہ میرے جیسا بندہ پالتا ہے

حسن وہ بن کے مکیں تیرے ہی مکان میں ہے
یہ کیا غضب ہے کہ تو اس کو جانتا بھی نہیں
وہ چھوڑ جاتا ہے ساحل پہ بھی مجھے تشنہ
اور اپنی لہروں کے اندر سمیٹتا بھی نہیں
وہ ڈستا رہتا ہے اک سانپ کی طرح مجھ کو
میں اس کو پالتا رہتا ہوں مارتا بھی نہیں

☩☩☩

غزلیں

ارشد عبدالحمید

ہے یہی وقت اگر سخت وفا پر کوئی ہے
سن بھی لے تیرے در جود و سخا پر کوئی ہے
رات کے کان کھڑے ہو گئے دیپک لرزا
دوست ہو یا کہ عدو پشت ہوا پر کوئی ہے
پھر وہی خواب ہے اور خواب میں روشن خیمہ
پھر رواں جادۂ آواز درا پر کوئی ہے
حبس کیسا بھی ہو رستے تو نکل آتے ہیں
روک اے یار بھلا دل کی صدا پر کوئی ہے
میں اگر دشت میں ہوں دل میں تراوٹ کیسی
کیوں یہ لگتا ہے لب جوئے صبا پر کوئی ہے
جس نے چاہا اسے مستحضر امکان کیا
پہرہ اس پیکر تخئیل نما پر کوئی ہے
تجھ سے بچھڑا ہوں مگر جان ابھی باقی ہے
تسمہ کیا اور مرے تسمۂ پا پر کوئی ہے

مجھ سا بیتاب یہاں کوئی نہیں میرے سوا
یعنی برباد جہاں کوئی نہیں میرے سوا
روشنی تھی تو کئی سائے نظر آتے تھے
تیرگی ہے تو یہاں کوئی نہیں میرے سوا
بھیڑ میں ایک طرف گوشہ اخلاص بھی ہے
غور سے دیکھ وہاں کوئی نہیں میرے سوا
شہر میرے ہی بھروسے پہ ہو خفتہ جیسے
ہدف شور سگاں کوئی نہیں میرے سوا
سربلندی مری تنہائی تک آ پہنچی ہے
میں وہاں ہوں کہ جہاں کوئی نہیں میرے سوا
شعر میں غیر کی تشبیہ کہاں سے آئے
میری مانند یہاں کوئی نہیں میرے سوا
چین لکھتا ہے مرے خواب کا راوی ارشد
اس سمندر میں رواں کوئی نہیں میرے سوا

☩☩☩

غزلیں

ارشد عبدالحمید

کوئی بھی شے ہو میاں جان سے پیاری کسے ہے
جان ہاری ہے تو یہ دیکھئے ہاری کسے ہے
کورنش گل کو کرے کلیوں کو آداب کہے
ہوش میں مملکت باد بہاری کسے ہے
دل میں بس ایک نمونہ ہے کہ دنیا پہ مٹا
نذر زیبا تھی کسے اور گزاری کسے ہے
ایک کھونٹے سے بندھے دشت و دمن دیکھے ہیں
اب میسر رم آہوئے تتاری کسے ہے
اڑ چلو منتخب خاص ہیں اس کے ہم لوگ
ورنہ حاصل یہ تمنا کی سواری کسے ہے
اک ستارے کے لئے سیر فلک کرتا ہوں
دوستو فرصت سیارہ شکاری کسے ہے

رکتے ہوئے قدموں کا چلن میرے لئے ہے
سیارۂ حیرت کی تھکن میرے لئے ہے
کوئی مرا آہو مجھے لاکر نہیں دیتا
کہتے تو سبھی ہیں کہ ختن میرے لئے ہے
تپ سی مجھے آجاتی ہے آغوش میں اس کی
وہ برف کے گالے سا بدن میرے لئے ہے
ہیں جوئے تب و تاب پہ انوار کے پیاسے
اور شام کا یہ سانولا پن میرے لئے ہے
باروت میں بھنتے ہوئے الفاظ و مفاہیم
اب تو یہی تصویر سخن میرے لئے ہے
دنیا ہی نہیں خود سے خفا رہتا ہوں ارشد
جینے کا یہ انداز ہی فن میرے لئے ہے

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

مجھ کو تقدیر نے یوں بے سر و آثار کیا
ایک دروازہ دعا کا تھا سو دیوار کیا
خواب آئندہ ترے لمس نے سرشار کیا
خشک بادل تھے ہمیں تو نے گہر بار کیا
دیکھنے کی تھی نگاہوں میں انا کی صورت
اس گرفتار نے جب مجھ کو گرفتار کیا
مدتوں گھاؤ کئے جس کے بدن پر ہم نے
وقت آیا تو اسی خواب کو تلوار کیا
میری چاہت نے عجب رنگ دکھایا مجھ کو
کشمکش سے مری آنکھوں کو گراں بار کیا
اک مسیحا کو مرا چشم نما ٹھہرایا
ایک قاتل کو مرا آئینہ بردار کیا
کاٹ کر پھینک دی سنسار کی کوچیں ہم نے
صبر کو پھول کیا پھول کو تلوار کیا

چراغ درد کہ شمع طرب پکارتی ہے
اک آگ سی لب دریائے شب پکارتی ہے
عدو سے جان بچی ہے نہ دوست بچھڑے ہیں
یہ شام گریہ ہمیں بے سبب پکارتی ہے
چراغ شوق پہ رہ رہ کے نور آتا ہے
ہوا بہ طرز رخ و چشم و لب پکارتی ہے
شہید آب و نمک ہیں سو بڑھتے جاتے ہیں
شکست و فتح پیادوں کو کب پکارتی ہے
صدائیں دیکھے بلاتی ہے شاہ بانوئے شہر
فقیر جسکے ہیں دیکھیں وہ کب پکارتی ہے
میں جیسے دن کی تب و تاب سے پریشاں ہوں
بوقت شام خوشی اک عجب پکارتی ہے
ہم ایسے کون انوکھے طلوع ہوتے ہیں
جو ہم کو دیکھ کے دنیا غضب پکارتی ہے

٭٭٭

غزلیں

ارشد عبدالحمید

کوئی سبیل ہو ایسی کہ سب سنبھلتے رہیں
ہوا بھی چلتی رہے اور دیے بھی جلتے رہیں
کوئی دعا کسی شبنم شعار ساتھی کی
ردا مثال ہو سر پر تو ہم بھی چلتے رہیں
تحیرات نگاہوں میں خیرگی بھر دیں
فصیل جاں میں دیے جستجو کے جلتے رہیں
یقین و صبر سلامت رہیں بہر صورت
رتیں گزرتی رہیں یہ درخت پھلتے رہیں
دعائیں اردو رسائل کی طرح بند نہ ہوں
یہ پرچے مطبع جاں سے سدا نکلتے رہیں

ہوائے حرص و ہوس سے مفر بھی کرنا ہے
اسی درخت کے سائے میں گھر بھی کرنا ہے
انا ہی دوست انا ہی حریف ہے میری
اسی سے جنگ اسی کو سپر بھی کرنا ہے
چل آ تجھے کسی محفوظ گھر میں پہنچا دوں
پھر اس کے بعد مجھے تو سفر بھی کرنا ہے
یہی نہیں کہ پہنچنا ہے آسمانوں پر
دعائے وصل تجھے اب اثر بھی کرنا ہے
ہمیں تو شمع کے دونوں سرے جلانے ہیں
غزل بھی کہنی ہے شب کو بسر بھی کرنا ہے

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

مہر و مہتاب کو میرے ہی نشاں جانتی ہے
میں کہاں ہوں وہ مری سرِرواں جانتی ہے

تم سے ہو کر ہی تو آئی ہے لہو تک میرے
تم کو یہ سرخیِ جاں شعلہ رخاں جانتی ہے

کون اپنا ہے سمجھتی ہے خموشی شب کی
اجنبی کون ہے آوازِ سگاں جانتی ہے

دل کو معلوم ہے کیا بات بتانی ہے اسے
اس سے کیا بات چھپانی ہے زباں جانتی ہے

خاک کو چھوڑ کے جانا ہمیں منظور نہیں
ہم خس و خار نہیں جوئے تپاں جانتی ہے

تو کبھی خواہش دنیا نہیں کرنے والا
میرے ابدال تجھے دانشِ جاں جانتی ہے

میرے پاس آکے بھی رہتی ہے گریزاں مجھ سے
میں نہ ڈوبوں گا مری موجِ گماں جانتی ہے

اس طرح گھورتی رہتی ہے شب و روز مجھے
جیسے دنیا مرے سب رازِ نہاں جانتی ہے

میں اسیرِ ہجر و وصال کا میں فقیر کوئے زوال کا
مری کفنی ہے غم و رنج کی مرا بوریا ہے ملال کا

مرے واسطے کسی شہر میں کوئی گھر نہیں کوئی در نہیں
وہی اک گلی ہے گمان کی وہی اک سفر ہے خیال کا

جو ملا تو کچھ بھی ملا نہیں جو گیا تو کچھ بھی گیا نہیں
مری سلطنت خس و خار کی مرا تخت کاہ و سفال کا

مرا شہر شہرِ فسوں نہیں مرا دشت دشتِ جنوں نہیں
میں نہ ذرہ خطۂ شوق کا میں نہ سبزہ باغِ کمال کا

مجھے پیاس ہے تو ہوا کرے میں گدا نہیں نہ طلب کروں
کبھی خود ہی چاہ سے دے مجھے کوئی قطرہ آبِ جمال کا

مرا حال مجھ پہ گراں نہ ہو مجھے کار دل میں زیاں نہ ہو
تو ہی چارہ گر مرے درد کا تو ہی پاسباں مرے حال کا

مجھے زندگی سے گلہ نہیں مرے ان دکھوں کی دوا نہیں
مجھے شوق نام و نمود کا مجھے روگ جاہ و جلال کا

اسی شاعری سے نم و نما اسی شاعری سے ہے رنگ و بو
یہی نہر میری زمین کی یہی پھول میرے نہال کا

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

جنس مخلوط ہیں اور اپنے ہی آزار میں ہیں
ہم کہ سرکار سے باہر ہیں نہ سرکار میں ہیں

آب آتے ہی چمک اٹھتے ہیں سب نقش ونگار
خاک میں بھی وہی جوہر ہیں جو تلوار میں ہیں

سب فروشندۂ حیرت ہوں ضروری تو نہیں
ہم سے بے زار بھی اس رونق بازار میں ہیں

حلقۂ دل سے نہ نکلو کہ سر کوچۂ خاک
عیش جتنے ہیں اسی کنج کم آثار میں ہیں

ہو چکا عدل دکاں بند کر اے تاجر حق
یہ سزا کم ہے کہ حاضر ترے دربار میں ہیں

سائباں سر پہ مرے دشت لہو ہے تو سہی
تجھ پہ مٹ جاؤں یہ امکان نمو ہے تو سہی

غیر کی آگ میں جلنے کیلئے کیوں جاؤں
شعلہ جاں مری تحویل میں تو ہے تو سہی

میں تہہ چادر صبر اس کو چھپا جاؤں تو کیا
میری دنیا میں بہر حال عدو ہے تو سہی

شہر میں خاک اڑانے کا مزہ تھا کچھ اور
یوں تو صحرا میں بھی آوازۂ ہو ہے تو سہی

یاد آتی تو ہیں دل کو وہ کٹورا آنکھیں
کچھ نمو آج بھی اطراف سبو ہے تو سہی

⊕⊕⊕

غزلیں

ارشد عبدالحمید

میرے اشعار تموج پہ جو آئے ہوئے ہیں
آب حیرت سے یہ مضمون اٹھائے ہوئے ہیں

شوخیاں کام نہ آئیں تو حیا دھو لے گی
اس نے آنکھوں کو کئی داؤ سکھائے ہوئے ہیں

کچھ ستارے مری پلکوں پہ چمکتے ہیں ابھی
کچھ ستارے مرے سینے میں سمائے ہوئے ہیں

اب وہ انسان کہاں جن سے فرشتے شرمائیں
ہم تو انسان کا بس بھیس بنائے ہوئے ہیں

غیر کو جمع کرو دشمن جاں کو بلواؤ
دوستو! ہم کسی اپنے کے ستائے ہوئے ہیں

شرط دیوار و در و بام اٹھا دی ہے تو کیا
قید پھر قید ہے زنجیر بڑھا دی ہے تو کیا

اب بھی تن تیغ سے لڑ جائے تو چھن بولتا ہے
وقت نے اس پہ اگر دھول جما دی ہے تو کیا

میرے خسرو نے مجھے غم بھی زیادہ بخشا
دولت عشق اگر مجھ کو سوا دی ہے تو کیا

ہم بھی تیار ہیں پھر جان لٹانے کے لئے
سامنے پھر وہی کوفہ وہی وادی ہے تو کیا

مجرم دل کو کہاں فیصلہ سننے کا دماغ
اس نے بخشا ہے تو کیا اور سزا دی ہے تو کیا

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

پہلے تو حسد بھائی کے کردار میں رکھ دی
پھر اس نے ترقی مرے گھر بار میں رکھ دی

اب اسکے کرم پر ہے وہ اپنائے کہ ٹھکرائے
عرضی تو میاں ہم نے بھی سرکار میں رکھ دی

اس نے مرے سینے میں محبت نہیں رکھی
بارود کی پڑیا تھی جو انگار میں رکھ دی

اب جیب کسی حال میں خالی نہیں رہتی
اک چیز مروت تھی سو بازار میں رکھ دی

تصویر مرے گھر کی بہت خوب ہے ارشد
بس کار یہاں آپ نے بیکار میں رکھ دی

حالات کی تنگی سے تعب سے نکل آئے
ہے کوئی جو اس میر کی شب سے نکل آئے

ہم کو تو محبت کے محافظ سے غرض ہے
ایران سے نکلے کہ عرب سے نکل آئے

حق چھین کے لینا بھی غلط تو نہیں لیکن
کیا حرج ہے گر حسن طلب سے نکل آئے

ہم حالت فرقت میں پریشان نہیں تھے
اب سوچ رہے ہیں کہ غضب سے نکل آئے

نقاد تھا وہ اس نے بہت شور مچایا
ہم لوگ کہ شاعر تھے ادب سے نکل آئے

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

عشق مرہون حکایات و گماں بھی ہوگا
واقعہ ہے تو کسی طور بیاں بھی ہوگا
دل عطیہ کہیں کرتا تو پریشاں ہوتا
خیر خوبی سے ہی ہوگا وہ جہاں بھی ہوگا
ایک دن دیکھنا رک جائیں گے دریا سارے
ایک دن دیکھنا یہ دشت رواں بھی ہوگا
آپ دنیا کو محبت کی دوا بیچتے ہیں
آپ کے پاس علاج غم ناں بھی ہوگا
تاج پایا تھا یہیں سر نے مگر جانتے ہیں
اس کو لے کر درِ دولت میں زیاں بھی ہوگا
ایک دن آ ہی ملیں گے مرے بچھڑے ہوئے لوگ
ختم اک روز تو یہ کار جہاں بھی ہوگا
دل بھی ویسا ہی ہے کیفیت جاں ہے جیسی
حال بدلا تو یہی رقص کناں بھی ہوگا
شدت ہجر ہے محسوس تو ہوگی ارشد
بوجھ سینے پہ اگر ہے تو گراں بھی ہوگا

جمع کل عالم کو اپنے روبرو کرتے تھے رات
تجھ سے بہتر کون تھا ہم کیوں غلو کرتے تھے رات
طرز پھولوں کی تھی لیکن چاندنی کی شاخ پر
خواب تھے اور خوشبوؤں میں گفتگو کرتے تھے رات
زخم بنتے تھے اجل کی روشنی آتی نہ تھی
دل سے کیسی دل لگی تیغ و گلو کرتے تھے رات
جشن تھا اور جشن کے پچھلے پہر کی رات میں
چند دیوانے تلاش کاخ و کو کرتے تھے رات
خواہشیں کیا تھیں کہ ظاہر ہو کے بھی ظاہر نہ تھیں
کیسے جنگل تھے کہ باطن میں نمو کرتے تھے رات
دشت جاں میں چوکڑی بھرتے غزالان خیال
ذرے ذرے کو شہید مشکبو کرتے تھے رات
اک ہوا تھی شمع سے اشجار تک مشغول تھی
ایک ہم تھے خالی بیٹھے ہاؤ ہو کرتے تھے رات
کون ایسی مئے تھی ارشد آپ جسکے پھیر میں
عمر بھر کی تشنگی نذر سبو کرتے تھے رات

✠✠✠

غزلیں

ارشد عبدالحمید

دیکھنے کی تھی ملن کے خواب میں رفتارِ شب
آنکھ ابھی جھپکی نہ تھی اور اڑ گیا رہوارِ شب

اجلے اجلے سے یہ سب منظر ہوا ہو جائیں گے
دن کے شیشے سے کھرچ کر دیکھئے زنگارِ شب

وہ ضمادِ نور وہ بادِ شفا کی آیتیں
صبح تک سو فیصدی بشاش تھا بیمارِ شب

بندشِ جاں سست ہو تو کیا تفکر کا جواز
عیب ہے اس نظمِ ہجر آثار میں تکرارِ شب

دن بھی ارشد اس سیہ خانے کی ہی توسیع تھا
ہم سمجھتے تھے کہ آخر ڈھے گئی دیوارِ شب

غزل میں جان پڑی گفتگو میں پھول کھلے
مری نوا سے دیارِ نمو میں پھول کھلے

مرے ہی شعر اچھالے مرے حریفوں نے
مرے طفیل زبانِ عدو میں پھول کھلے

انہیں یہ زعم کہ بے سود ہے صدائے سخن
ہمیں یہ ضد کہ اسی ہاؤ ہو میں پھول کھلے

یہ کس کو یاد کیا روح کی ضرورت نے
یہ کس کے نام سے میرے لہو میں پھول کھلے

بہار اب کے نہ ٹھہری کسی بھی قریے میں
نہ باغِ خواب نہ صحرائے ہو میں پھول کھلے

✠✠✠

میرے نقطہ نظر سے

ہجوم آئینہ (شعری مجموعہ)

خبر تحیر (رباعیوں کا مجموعہ)

شاعر : ڈاکٹر فرید پربتی
سن اشاعت : ۲۰۱۰ء
۲۰۰۷ء
ضخامت : ۱۵۴ صفحات
قیمت : ۵۰۰/روپے
۸۵ صفحات
۱۵۰/روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

اس وقت ڈاکٹر فرید پربتی کی دو کتابیں ''ہجوم آئینہ'' اور ''خبر تحیر'' میرے پیش نظر ہیں۔'ہجوم آئینہ' میں پانچ منظر نامے پیش کئے گئے ہیں۔'ہزار امکاں'،'فرید نامہ'،'گفتگو چاند سے'،'خبر تحیر' اور 'ہجوم آئینہ'۔اس کے دلکش محتویات بیحد پرکشش ہیں۔ابتدحمدیہ اور نعتیہ اشعار سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرید پربتی اپنی متنوع غزلوں سے قاری کو آشنا کرنے کی سعی مستحسن کرتے ہیں۔ غزل اپنے مزاج کے اعتبار سے بیحد لچک دار واقع ہوئی ہے۔پربتی اس صنف کی روایات کی نہ صرف خبر رکھتے ہیں بلکہ اپنے فن میں کلاسیکی آہنگ کے ساتھ ساتھ جدید تیور کی بھی خبر دیتے

ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال کریں جو جدت برائے جدت کا آئینہ دار ہو۔ ان کا واضح اسلوب دراصل روایات کا پرتو ہے۔ موصوف تشبیہ و استعارے کے ایسے پہلو جو Heterogeneous نہیں انہیں برت کر معنوی پہلوؤں کو واضح سمت عطا کرتے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ جدت طرازی کے نام پر نامانوس رویہ اختیار کریں۔ لیکن ایسا ہے کہ وہ اپنے اظہارات میں معنوی لحاظ سے ایسے مضمرات پیدا کرتے ہیں جن سے مفہوم کی دنیا وسیع تر ہو جاتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

گماں کی سرحدوں سے پار نکلا
ہوا رفتار میرا یار نکلا

باغ کی رونق ہوئی جس سے ہوا
وہ فساد خشک و تر مجھ کو دیا

یہ کیا کہ شب و روز فقط ان کی تمنا
یہ کہ محبت کو عیاں کر نہیں پاتے

اس طرح کے اشعار معنوی لحاظ سے بہت دور نہ لے جاتے ہیں لیکن متاثر ضرور کریں گے۔ موصوف کی ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے 'زیر آب'۔ پوری غزل بجی دھجی معلوم ہوتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ فنکار کو لفظوں پر کیسا اختیار ہے کہ وہ انہیں اپنے طریقۂ خاص سے برتتا چلا جاتا ہے اور معنویت کی گہری فضا میں پڑھنے والوں کو ڈبو دیتا ہے۔ اسی غزل کا آخری شعر ہے:

ٹھہروں اگر تو وسوسہ تغیانیوں کا ہے
اور لوٹنا بھی چاہوں تو منزل ہے زیر آب

یہاں ہر لفظ تہداری کے مرحلے سے گزر رہا ہے اور معنی کی کتنی ہی جہتیں پیدا کر رہا ہے۔ ایسے معنی آفریں اشعار اس مجموعے میں بکھرے پڑے ہیں۔

"فرید نامہ" دراصل رباعیوں پر مشتمل ہے۔ "شہر آشوب" کے عنوان سے پانچ رباعیاں ہیں جن سے شاعر کے دل کے التہاب کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے شعور آگہی کے حسیات کو پیش کرتے ہوئے لازماً تمام تر رباعیاں فکر و احساس کی دنیا سجاتی معلوم ہوتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کسی ایک موضوع میں بند نہیں۔ "سرمد کے مزار پر" کے عنوان سے دو رباعیاں ہیں وہ ان کی متصوفانہ فکر کی آئینہ دار تو ہیں ہی ان کے دل اور ذہن و دماغ کے گداز کا

بھی آئینہ ہیں۔

"گفتگو چاند سے" ویسی ہی غزلوں کا آئینہ ہے جن کی بابت میں پہلے ہی اظہار خیال کر چکا ہوں۔ دراصل ڈاکٹر فرید پربتی ایک طرف تو اپنی ذات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو دوسری طرف وہ تمام تر زندگی کے احوال وکوائف سے بھی دور ہونا چاہتے ہیں۔ اسی طرح "خبر تحیر" اور "ہجوم آئینہ" میں جو کچھ بھی پیش ہوا ہے وہ دراصل ان کی سوچ اور فکر کی صداقت کا اعلانیہ ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ "ہجوم آئینہ" لازماً ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس سے فرید پربتی کے کمالات کی پوری خبر ہوتی ہے۔ وہ اپنے احساسات کو بڑی بے تکلفی سے شعر میں ڈھال دیتے ہیں اور اس کا احساس دلاتے ہیں کہ ان کے یہاں صرف اختراعی صلاحیتیں ہی نہیں بلکہ پیشکش کا وہ انداز بھی ہے جو بلاشبہ بیحد پرکشش اور فنی ہے۔

دوسری کتاب "خبر تحیر" ہے، اس میں رباعیات ہیں۔ رباعی گوئی ایک خاص فنی صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے عروضی اور معنوی دونوں ہی سطحوں سے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ فرید پربتی ان دونوں حیثیتوں سے Genuine نظر آتے ہیں۔ رباعی ان کے مزاج سے لگا کھاتی ہے اور ان کی تخلیقی توانائی کو چست بنا کر پیش کرتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے احساسات ان کے ذاتی احساسات ہیں۔ پھر وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان میں شریک کرنے کی بے پایاں صلاحیت رکھتے ہیں۔ کہیں وہ فکر واحساس کے ایسے شاعر معلوم ہوتے ہیں جہاں زندگی کے تجربے کسی کو مکمل بنا دیتے ہیں۔ ایسی تکمیل گاہے گاہے ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ چاہے صوفیت کے مسائل پیش کریں یا زمانے کے آشوب کو رباعی میں ڈھالیں وہ یکساں کامیاب نظر آتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ "خبر تحیر" رباعی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ہر ذی علم وذی شعور کو متاثر کرے گا۔ میں ذیل میں ان کی چند رباعیاں نقل کرتا ہوں جن سے ان کے دل کی کیفیت بھی واضح ہوتی ہے اور ذہن کا تحیر بھی:

سمجھو کہ لگاؤ گے فقط رٹ میری
پاؤ گے چہار سمت آہٹ میری
جب تجھ پہ کمالات کھلیں گے میرے
سجدوں سے سجادو گے چوکھٹ میری

مٹنا ہے عدو کے سد و حد کو اک دن

اس گھات کو ، دمدمہ کو، زد کو، اک دن
گھبرا نہ مسلط ہے جو اشرم کی فوج
آئیں گے ابابیل مدد کو اک دن

دامن کو میں اشکوں سے بھگو دیتا ہوں
آہوں کی نئی فصل بھی بو دیتا ہوں
وہ ریت کے گھر بنا کے خوش ہو جانا
آتے ہیں وہ دن یاد تو رو دیتا ہوں

بے وجہ کبھی پاس نہ آتے ہیں خواب
کیا ہم پہ گزرنا ہے بتاتے ہیں خواب
ڈستے ہیں بہت جاگ کے منظر مجھ کو
جو آنکھ کروں بند ستاتے ہیں خواب

باہوش تھا لیکن میں بے ہوش رہا
زندہ تھا مگر موت سے ہم آغوش رہا
ایسے بھی مقاموں سے میں گزرا ہوں فرید
وہ کہتا رہا اور میں خاموش رہا

واقف میں ہر اک خواب کی تعبیر سے ہوں
میں حسن ہوں اور حسن کی جاگیر سے ہوں
کہتے ہیں مجھے یوسف ثانی اے دوست
کنعاں سے نہیں وادیٔ کشمیر سے ہوں

یہ رباعیاں فرید پربتی کے احساس جمال کی عکاس بھی ہیں اور نیرنگی طبع کی بھی۔ دونوں مجموعے اس لائق ہیں کہ آپ کے سامنے ہوں تو اوران کے مطالعے سے ذوق سلیم کو لازماً تسکین ہوتی ہے۔

مبصر: وہاب اشرفی

کہتا ہوں سچ کہ...... (انشائیے)

مصنف : تمنا مظفر پوری سن اشاعت : ۲۰۰۷ء
ضخامت : ۱۱۲ صفحات قیمت : ۱۲۰/روپے
ناشر: تمنا مظفر پوری، سمن زار اے ب، جمیل کمپاؤنڈ، سمن پورہ، پٹنہ

تمنا مظفر پوری سے میں قریب رہا ہوں۔ ایک زمانے سے وہ طنز و مزاح کے تخلیقی جہات سے وابستہ ہیں۔ اس سے پہلے ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔ پھر ان کا ڈرامہ ۱۹۸۹ء میں اشاعت پزیر ہوا لیکن زیر نظر مجموعہ "کہتا ہوں سچ کہ" انشائیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ انشائیہ بھی طنز و مزاح کے بغیر لکھا نہیں جا سکتا۔ لہذا اس مجموعے کو بھی دوسرے مجموعے کے ساتھ ایک تسلسل کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔ اردو طنز و مزاح لکھنے والوں کی یہ عمومی خوبی رہی ہے کہ وہ طوالت سے گریز کرتے ہیں اور اختصار اور جامعیت کو راہ دیتے ہوئے ہنسی کھیل کے انداز میں ایسے نکات پیش کر دیتے ہیں جن سے زندگی کی ساری ناہمواریاں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ تمنا کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی بھی ہے۔ وہ اپنے جملوں کو اس طرح تراشتے ہیں کہ طنز کی دھار تند و تیز نہیں رہتی بلکہ ایک خاص قسم کے کیپسول میں روپوش ہو کر قابل برداشت بن جاتی ہے۔ دراصل دوسرے انشائیہ نگاروں کی طرح تمنا بھی بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز (Association of Ideas) کے فنی کیف و کم سے آگاہ ہیں کہ نہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اصطلاحات کی فنکار کو خبر ہو۔ یہ تو معاملہ نقادوں کا ہے کہ وہ بعض چیزوں کا نام دے کر اصول منضبط کر لیتے ہیں۔ لیکن خالق ایسے اصول کا اسیر نہیں ہے۔ تمنا اپنے بیانات میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں لیکن ربط ٹوٹتا نہیں۔

زمانہ اور حالات کے آشوب سے کس کو خبر نہیں۔ سبھی ان سے متاثر ضرور ہیں لیکن سبھی انہیں فنی جامہ پہنا نہیں سکتے۔ فنکار کا کمال یہی ہے کہ وہ ذاتی اور انفرادی تجربے اور مشاہدے کی آنچ کو اس طرح اپنی تخلیق میں ڈھال لیتا ہے کہ پڑھنے والا شریک ہو جاتا ہے اور ایک پراسرار کیفیت سے گزرتا ہے۔ تمنا کے کئی انشائیے ان کے نجی مشاہدات کا آئینہ ہیں لیکن وہ آئینہ کہیں چھپا کر نہیں رکھتے بلکہ سبھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ چند انشائیوں کے بس

عنوانات لکھ رہا ہوں جنہیں ممکن ہو تو آپ بھی مطالعہ کر لیں۔ متعلقہ محتویات سے واقف ہونے کے بعد لازماً ایک عالم خیال روشن ہو جاتا ہے اور جناب تمنا کو ان کی تخلیقی کاوشوں کے لئے مبارک باد دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں ذیل میں چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ وہ آپ کی نگاہ میں رہیں تو پھر ان کے فکر و فن کی تفہیم میں آسانی ہوگی اور یہ بھی کہ موصوف کی فنی جہات کس اُور اور سمت رواں دواں ہے تو عنوانات اور متفرق اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

(۱) میں (۲) ہم (۳) ت م پیش تم (۴) وہ (۵) بریکیٹ (۶) مجھے ایک بیوقوف کی تلاش ہے (۷) بارے کچھ جوتے کا بیان ہو جائے (۸) قصہ اپنے بالوں کی سفیدی کا (۹) مہمان کیسے کیسے (۱۰) چوری اور میری بزرگی (۱۱) کتے (۱۲) نئے سوٹ کی مصیبت (۱۳) رسم (۱۴) دعوت (۱۵) ٹانگ (۱۶) ناک (۱۷) یارب دل دے (۱۸) فکشن کیا ہے؟ (۱۹) ہزاروں خواہشیں ایسی (۲۰) ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے (۲۱) بیلن (۲۲) قصہ میرے انشائیہ نگار بننے کا (۲۳) کہتا ہوں سچ کہ...... (۲۴) ٹنڈر مطلوب ہے۔

''ہاں تو جناب بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہم بات کر رہے تھے ہم کی اور بات نکل آئی اردو قواعد کی۔ اب ہم بڑے ہو کر جو بھی بقراطی کر لیں لیکن قواعد پڑھنے کا مزہ بچپن میں ہی ہے۔ بڑے ہو کر کون پڑھتا ہے۔ ویسے اب تو ہم کچھ کچھ سمجھنے لگے ہیں کہ میں اور ہم میں کیا فرق ہے اور کس طرح بولنا چاہئے۔ میں لفظ کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن عام طور پر ہم بولتے ہیں۔ جب کہ کچھ علاقے کے لوگ میں اس انداز سے بولتے ہیں گویا ان کے 'میں' میں غرور ہے۔ لیکن بار بار میں کہتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے بکری کی طرح میں میں کر رہے ہیں، لیکن ہم کے ساتھ ایسا نہیں۔ ہزار بار بھی ہم کہئے ہم کی ہما ہمی قائم رہے گی۔ بکری کی طرح ممیانے کی بات نہیں آئے گی۔ (''ہم'' ص،۱۳)

''ایک صاحب کا کسی محترمہ پر دل آ گیا۔ گھر میں ایک بیوی موجود تھی پھر بھی نکاح پڑھوا کر دوسری لے آئے۔ دونوں بیویوں میں روزانہ جم کر لڑائی ہونے لگی۔ روز روز کے ہنگامے کو دیکھ کر رشتہ داروں کو سامنے آنا پڑا اور ان کی مداخلت پر یہ طے پایا کہ شوہر نامدار ایک دن پہلی بیوی کے ساتھ رہیں اور ایک دن نئی کے ساتھ گزاریں۔ زندگی تو سماج اور خاندان میں رہ کر گزارنی تھی لہذا قہراً و جبراً اس فیصلے پر عمل کرنا پڑا۔ اس طرح کچھ دن بیت گئے تو ایک روز بڑی بیگم نے محسوس کیا کہ میاں کے سر میں سفید بالوں کی کمی ہو رہی ہے۔ انہیں حیرت ہوئی۔ فوراً دائی سے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ چھوٹی بیگم سفید بال چن کر نکال دیتی ہے تا کہ میاں جوان نظر

آئیں۔بس کیا تھا بڑی بیگم کو چھوٹی بیگم کے دل جلانے کا نسخہ ہاتھ آ گیا وہ میاں کے سر سے سیاہ بال نکالنے میں جٹ گئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر نامدار کے سر سے سارے بال غائب ہو گئے اور وہ مشہور فلمی کیریکٹر بن گئے۔"('قصہ اپنے بالوں کی سفیدی کا'،ص ۳۹)

"یارب دل دے کہ معنی اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئے مگر جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ایک دن میرے گھر آئے کچھ مہمانوں میں ایک چاند سی صورت بھی نظر آئی جسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تب میں نے جانا کہ انسان کے اندر ایک ایسی چیز بھی ہوتی ہے جسے دل بھی کہا جاتا ہے جو نہ صرف دھڑکتا ہے اور خون پیدا کرتا ہے بلکہ کسی پر "آ" بھی جاتا ہے۔یعنی اس میں کچھ خواہشیں بھی ہوتی ہیں کچھ کیا بلکہ ہزاروں خواہشیں ہوں گی تو ان میں کچھ جائز ہوں گی اور کچھ ناجائز بھی اور یہ خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔دل کی اس خواہش کے سامنے حضرت انسان بڑا مجبور ہو جاتا ہے۔اس قدر مجبور اور بے بس کہ وہ طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔"('یارب دل دے'،ص ۸۰)

"ازدواجی زندگی میں بیلن کی بڑی اہمیت ہے۔جس گھر میں بیلن نہیں ہوگا ظاہر ہے وہاں روٹی نہیں بنے گی اور روٹی نہیں بنے گی تو انسان کھائے گا کیا؟ گویا انسان بیلن کی وجہ سے ہی روٹی کھاتا ہے۔ویسے روٹی کی وجہ سے اکثر لوگوں کو بیلن کھانا پڑتا ہے۔"(بیلن،ص ۹۹)

مجموعی اعتبار سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جو تمنا کے فنی ارتقا کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

مبصر: وہاب اشرفی

حسن التماس (شعری مجموعہ)

مصنف : حیرت فرخ آبادی — سن اشاعت : ۲۰۰۸ء

ضخامت : ۱۷۶ صفحات — قیمت : ۲۰۰/روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

"حسن التماس" جھارکھنڈ کے ایک کہنہ مشق شاعر حیرت فرخ آبادی کا تازہ مجموعہ کلام ہے۔اس سے قبل ۱۹۸۷ء میں "نوائے ساز دل" کے نام سے ان کے پہلے مجموعہ کی اشاعت ہوئی تھی اور اب تقریباً ۲۱ سال کے بعد ان کا زیر نظر مجموعہ شائع ہوا ہے۔جو غزلیات وقطعات، منظومات اور گیت پر مشتمل ہے۔حیرت کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ان کے والد متھرا پرساد

مثر اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا تخلص نامی تھا۔

زیر نظر مجموعے میں ۶۲ غزلیں، ۸ نظمیں، ۳۷ قطعات اور ۱۳ گیت شامل ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر قمر رئیس اور علی احمد فاطمی جیسے معروف اور معتبر اہل قلم کی بصیرت افروز تحریریں ہیں۔ تقریظ پروفیسر وہاب اشرفی نے قلم بند کی ہے اور پیش لفظ پروفیسر قمر رئیس کا ہے اور ایک مضمون ''حیرت اور محبت کا شاعر۔ حیرت فرخ آبادی'' کے عنوان سے جناب علی احمد فاطمی کا ہے۔ ماشاءاللہ اب فاطمی صاحب بھی پروفیسر ہو گئے ہیں۔ '' کچھ میرے خاندان اور میرے متعلق'' میں خود حیرت صاحب نے اپنے خاندان کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں، وہ بہت حیرت زا ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شعری سروکار کو سمجھنے میں معاون بھی۔ مثلاً یہ کہ ان کے والد متھرا پر سادا ایک برہمن زمیندار تھے۔ کم عمری میں ہی ایک میلے میں گم ہو گئے تھے۔ اس وقت وہاں کچھ عیسائی مشنریوں کے ارکان موجود تھے، ان کی نظر حیرت کے والد پر پڑی اور وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئے اور کرسچین بورڈنگ ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور وہ باقاعدہ کرسچن ہو گئے۔ انٹر اور گریجویشن کے بعد انہوں نے سہارن پور سیمینری سے پادری کا کورس کیا۔ اس کے بعد انہیں بنارس، بہرائچ اور پھر فرخ آباد کے دو گرجوں ''رکھا چرچ'' اور ''برھپور چرچ'' کا پاسٹڈ بنادیا گیا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ وہ ۴۱ سال کی عمر میں نو زبانوں سے واقف ہو گئے۔ انہوں نے جو زبانیں سیکھیں وہ اردو، فارسی، عربی، ہندی سنسکرت، انگریزی، یونانی، عبرانی اور لاطینی تھیں۔

حیرت فرخ آبادی کا ننھالی پس منظر بھی کم دلچسپ نہیں۔ ان کے نانا فرخ آباد کی ایک تحصیل قائم گنج کے افغانستانی پیٹھان اور اپنے عہد کے معروف ڈاکٹر تھے۔ وہ اولاد کی چاہ میں عیسائی مبلغین کے زیر اثر آئے اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ عیسائی بن گئے۔ ان کی اپنی صاحبزادی سے حیرت کے والد کی شادی ہوئی تھی۔ گویا دیکھا جائے تو حیرت کی رگوں میں والد کی طرف سے برہمن اور والدہ کی طرف سے افغانی مسلم خون کی آمیزش ہے۔ اس ضمن میں خود حیرت کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''تو جناب یہ حقیقت ہے میرے خاندان کی، اب آپ ہی بتائیے کہ میں کس سے محبت یا کس سے نفرت کروں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ جب بھی کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی مارا جاتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا ہی خون بہہ رہا ہے۔ اگر ہم اپنے خاندانوں کی ہسٹری ٹریس کریں تو کچھ ایسا ہی نظر آئے گا۔ ہم اپنی مرضی سے کسی خاندان میں پیدا نہیں ہوئے۔ ہندو،

مسلمان، عیسائی خاندان میں ہمیں پیدا کرنے والا اوپر والا ہے اور ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب کی تعلیم سے نیک بننے اور آپسی بھید بھاؤ کو مٹا کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر ایک خوشحال زندگی کا نمونہ پیش کریں تا کہ ساری دنیا میں خوشحالی اور بھائی چارہ خوشبو کی طرح پھیل جائے اور امن وسکون سے یہ دنیا معمور ہو جائے۔ اپنے خاندان کے حالات آپ تک پہنچانے میں میرا صرف یہی ایک مقصد تھا اور کچھ بھی نہیں۔ علامہ اقبال نے شاید یہ شعر میرے لئے ہی کہا ہوگا:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

(حس التماس، ص۱۰،۹)

گویا ''حس التماس'' کا شاعر قومی یکجہتی کا زندہ نمونہ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کی خاکساری، خوش خلقی، دلداری، منکسر المزاجی، ملنساری اور میزبانی وغیرہ اس طرح سامنے آتی ہے جیسے میں ان کا ملنے والا نہیں بلکہ قریبی رشتہ دار ہوں۔

''حس التماس'' کی شاعری ایک متوازن قسم کی شاعری ہے۔ حیرت فرخ آبادی تقریباً پچاس برسوں سے پرورش لوح وقلم کررہے ہیں۔ انہوں نے اساتذہ کو خوب پڑھا ہے اور مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری جیسے بزرگوں کی صحبت سے استفادہ بھی کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی راہ پر ہی چلنا مستحسن ہے۔ حیرت کا کلام کلاسیکی رچاؤ اور عصری حسیت دونوں کا آئینہ دار ہے۔ وہ روایت کے ساتھ عصری تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں پر بھی نگاہ مرکوز رکھتے ہیں اور ایسے موضوعات کو شعر میں ڈھالتے وقت عدم توازن کا شکار نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے کہ ان کا انداز کلاسیکی ہے لیکن وہ علامات واستعارات کی کارکردگی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انہیں برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ دیگر Figures of Speech کی بھی خبر رکھتے ہیں، جنہیں وہ خوبصورتی سے گاہے بگاہے بروئے کار بھی لاتے ہیں۔ گویا حیرت کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ جدید حسیت کو اپنے کلام میں پیش کریں۔ اس باب میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ چونکہ موصوف انگریزی کے استاد رہے ہیں اس لئے اس زبان میں ہونے والے تجربوں سے بھی آشنا ہیں۔ وہ وجودی افکار سے بھی واقف ہیں اور تنہائی کے پیچ وخم سے بھی۔ لیکن ان کے اظہار میں وہ کہیں بھی بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ لہذا کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے فن میں ریاضت، جمالیاتی کیف اور اجتہاد واختلاف کی گنجائشوں کو روا رکھتے ہوئے روایت کے

احترام کے قائل نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ وہ سادگی وسلاست کو پسند کرتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ سادگی Stale بن جائے۔ اس لئے ان کے کلام میں گاہے گاہے جدید محاورے اور ضرب المثل کی بھی بندش ملتی ہے۔

حیرت فرخ آبادی غم والم کے شاعر نہیں لیکن زندگی کی اندوہناکی سے وہ صرف باخبر ہی نہیں بلکہ اسے شاعرانہ وصف دینے میں ایک خاص فنی روش اختیار کرتے ہیں۔ ان کے خاندان کا جو پس منظر ہے وہ انہیں یگانگت سے قریب کرتا ہے اور جو ان کی شاعری کی بھی اساس ہے۔ میں ذیل میں پروفیسر قمر رئیس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو حیرت فرخ آبادی کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہے:-

''حیرت صاحب بلاشبہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ شعر میں الفاظ کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ صرف یہی نہیں ان کا تخلیقی شعور بھی بالیدہ ہے جس کا اظہار موز وعلائم کے ماہرانہ استعمال میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے کلام میں، ان کی انفرادی پہچان قائم نہیں ہوسکی۔ اس کا بڑا سبب شاید یہ ہو کہ وہ روایت اور جدت کے درمیان ایک راستہ نکالنے کی تگ ودو کرتے رہے۔ مجموعی طور پر حیرت صاحب کی فکر کے تخلیقی آب ورنگ میں بنی نوع انسان سے ان کی محبت، انسانی دردمندی اور رواداری کے ستارے روشن رہے۔ ان کے فن کے کمال وہنر کے یہی وہ صالح اور روشن پہلو ہیں جن کی داد اہل نظر ضرور دیں گے'' (حس التماس، ص ۲۱)

پروفیسر وہاب اشرفی کی رائے ہے کہ:-

''حیرت بنیادی طور پر زبان کے شاعر ہیں۔ جس ماحول اور جن حالات سے گزرے ہیں، ان میں لسانی توڑ پھوڑ کے امکانات کم سے کم پیدا ہو سکتے ہیں لہذا موصوف بھی اس طرف توجہ نہیں کرتے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں جو شعور بالیدہ ہوا ہے وہ اساتذہ کے معیاری کلام کے مطالعے کی عقبی زمین ہے۔ لہذا تشنگی کا سوال غیر اہم بن جاتا ہے...... ......جناب حیرت کوشش کرتے ہیں کہ عصری میلانات کی پیشکش میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔''

(حس التماس، ص ۱۲)

حیرت کی شاعری کے سلسلے میں پروفیسر علی احمد فاطمی کی یہ رائے بھی حقیقت پر مبنی ہے:-

''جدید شاعری کے اس الجھے ہوئے دور میں حیرت کی شاعری حیرت میں ڈالتی ہے۔ مسرت وانبساط کے نئے درواکرتی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ایسی شاعری کا استقبال کرتا ہوں۔ جمالیات ہندوستانی تہذیب وثقافت کالبادہ اوڑھ کر اسے مزید دبیز وبلیغ بناتی ہے۔'' (حس التماس، ص ۲۷)

منقولہ اقتباسات سے حیرت فرخ آبادی کی شخصیت اور ان کے فکری و فنی سروکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ذیل میں، موصوف کی غزلوں کے چند اشعار اور دو قطعات پیش کرتا ہوں تا کہ آپ ان سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ پہلے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غموں کی آگ ہے دل میں جہان جلتا ہے
ذرا یہ آگ بجھاؤ تو کوئی بات بنے

اوڑھ کر سو گیا وہ سورج کو
سرد آہوں سے روز جلتا ہے

روشنی کر نہ سکے دیر و حرم کے دیپک
اس اندھیرے میں مرا دل ہی جلا ہے یارو

رک گئی ہیں ہماری سانسیں تک
یہ جہاں کتنا تیز چلتا ہے
یورشیں جھیلتا ہے موسم کی
مدتوں بعد پیڑ پھلتا ہے

ان دنوں جی دکھا سا رہتا ہے
ہر گھڑی دل بجھا سا رہتا ہے
چار سو نفرتوں کی بارش ہے
زخم دل کا ہرا سا رہتا ہے

ڈھونڈنے نکلے ہیں تجھ کو یہ خلاؤں سے پرے اب
منکشف کر دیں گے اسرار نہاں خاکی پرندے

اب دو قطعات دیکھیں:

تلاش حق میں زمین و زماں سے لوٹ آئے
جہاں نہ پیار ملا اس مکاں سے لوٹ آئے
حرم و دیر کی فرقہ پرستیاں توبہ!
گئے تو ہم بھی تھے، لیکن وہاں سے لوٹ آئے

شہر کے لوگ نظر آتے ہیں پتھر کی طرح
اب تو چبھنے لگا ہر پل کسی نشتر کی طرح
ذہن ودل اس طرح مجروح ہوئے ہیں کہ نہ پوچھ
زندگی ہو گئی ہے درد کے منظر کی طرح

ان اشعار میں نہ صرف روایت اور جدت کا امتیاز جھلکتا ہے بلکہ زبان و بیان پر شاعر کی قدرت، فطری رنگ و آہنگ اور تشبیہ و استعارہ کو برتنے کا سلیقہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ کاغذ سفید اور دبیز استعمال ہوا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ امید قوی ہے کہ ادبی حلقوں میں خوش دلی سے اس کی پذیرائی ہوگی۔ شائقین ذیل کے پتہ سے اسے حاصل کرسکتے ہیں:

حیرت فرخ آبادی، کھوسلہ ہاؤس، گراؤنڈ فلور، نارتھ آفس پاڑہ، ڈورنڈہ، رانچی، ۸۳۴۰۰۲

مبصر: ہمایوں اشرف

عصمت آپا: اس ایک شام کی گفتگو

مصنفہ : شکیلہ رفیق اشاعت دوم : فروری ۲۰۰۷ء
ضخامت : ۱۰۴ صفحات قیمت : ۱۵۰/روپے

ناشر: الحمد پبلی کیشنز، رانا چیمبرز، سیکنڈ فلور (چوک پرانی انارکلی) لیک روڈ، لاہور

شکیلہ رفیق پاکستان کی غیر معروف افسانہ نگار نہیں۔ ان سے لوگ واقف ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر ان کی کتاب ''عصمت آپا: اس ایک شام کی گفتگو'' ہے۔ یہ یاد یار مہرباں کی ایک حسین اور رنگین تصویر ہے جو دراصل شکیلہ رفیق کے لئے ہوئے عصمت چغتائی کے ایک طویل انٹرویو کی ریکارڈنگ پر مشتمل ہے اور جس میں ادبی، علمی، سماجی، مذہبی، نسوانی، معاشرتی، خاندانی نیز ازدواجی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایسے مسائل ہیں جو اہم ہیں۔ انٹرویو میں خواتین کے تعلق سے اٹھائے گئے سوالات پر ڈاکٹر صالحہ عابد حسین کا افسانہ ''ایک سوال'' اس وقت میرے ذہن پر دستک دینے لگتا ہے۔

زیر نظر کتاب کی اہمیت وافادیت پر رائے زنی کرتے ہوئے فہمیدہ ریاض لکھتی ہیں:-

''اردو کے عصری ادب میں عصمت چغتائی کی ذات اور ان کی تحریر پر خاصے چھینٹے اڑائے گئے

ہیں۔'اس ایک شام کی گفتگو' میں پہلی بار معترضین کی ذہنی پستی کو کھل کر سامنے لایا گیا ہے اور بے جھجک ان کا ذکر کیا گیا ہے۔اس لحاظ سے یہ کتاب بہت قیمتی ہو جاتی ہے۔عصمت کی تحریروں کو دفاع کی ضرورت نہیں لیکن ان کے حق میں اٹھائی جانے والی ہر آواز آزادی فکر و اظہار اور جاندار، توانا، جرأت منداور سر سبز و شاداب ادب کا دفاع کرتی ہے اور اسے تحفظ دیتی ہے اور اس کی ضرورت ہمارے ادب کو جتنی آج ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔عصمت کا ہمارے ادب سے یہی رشتہ ہے اور شکیلہ نے اس رشتے کو نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔" (ص،۱۰)

سبھی جانتے ہے کہ 'عصمت چغتائی اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے کہ جس کے کمال کا اعتراف کئے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی' جنہوں نے اپنی نسائی حسیت، جدت پسند طبیعت، قوت مشاہدہ اور بے باکانہ طرز بیان سے قارئین کو اس قدر چونکایا بلکہ برانگیختہ کیا کہ ان کو باغی خاتون افسانہ نگار یا لیڈی چنگیز خاں کہا گیا۔لیکن عصمت چغتائی کا اہم سروکار سماج کی سفاک حقیقت کو ادب میں اجاگر کرنے سے رہا ہے۔وہ گھریلو زندگی کی نقاب کشائی کرتے ہوئے سماجی بندشوں سے ٹکرانے کی سعی کرتی تھیں۔وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:۔

"میری کوئی کہانی تخیل کی پیداوار نہیں۔ جب کوئی مسئلہ دماغ میں الجھ جاتا ہے تو ایک بے نام سی خلش ہوتی ہے اور کہانی کی صورت میں ایک بوجھ سا دل سے اتر جاتا ہے......وہ جسے کیفیت کہتے ہیں انسان کے دل میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ کسی واقعہ یا پابندی سے متاثر ہوتا ہے۔جھنجلاہٹ، غصہ، غم اور مختلف جذبات ابھرتے ہیں اور میرا تجربہ ہے کہ کہانی یا مضمون کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کر دینے سے نسبتاً سکون مل جاتا ہے۔"

(عصمت چغتائی سے ایک ملاقات، شیرازہ، سری نگر جلد، ۳۰، شمارہ ۱۰، ۸)

سیکس (Sex) کے مسائل سے عصمت چغتائی کی وابستگی کا حال روشن ہے۔اس ضمن میں طاہر مسعود کو دئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:۔

"یہ کمبخت سیکس کیا ہے؟ ہر نقاد اس کو گندہ لکھتا ہے۔سیکس تو بڑی مقدس چیز ہے۔اس کو کیسے گندہ کہہ سکتے ہیں۔خود تمہارا وجود بھی تو سیکس سے ہے۔پھر یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی ان نقادوں کو، صرف اس میں گندگی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ان کلوؤں کو اتنی عقل نہیں کہ سیکس نہ ہوتا تو آج دنیا میں ہم سب کا وجود نہ ہوتا۔منہ جلوں کو صرف سیکس گندہ ہی دکھتا ہے۔ اس کا احترام نہیں کرتے۔میرے خیال میں یہ نقاد سیکس کے توسط سے نہیں آئے......آسمان سے گرے ہیں۔اسی لئے تو سیکس کو برا کہتے ہیں۔جس کسی کو دیکھو وہی مجھے جنس رائیٹر کہتا ہے۔

میری تخلیقات جنسی، میرے خیالات جنسی، میرا سب کچھ جنس ہے، کھونگوڑے کہو میری بلا سے۔"

عشق فن کاروں کا بڑا وقیع موضوع رہا ہے اور اس کی بعض جہتوں کے رموز اب بھی تشنہ اظہار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کے معاملات عصمت چغتائی کے فن کی شناخت بھی رہے ہیں۔ لیکن ان کی تفہیم میں وہ افلاطونی فکر اختیار نہیں کرتیں بلکہ اس کے لئے انہی رموز کو پیش نگاہ رکھتی ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے۔ ان کا بے باکانہ اظہار عشق کے کلاسیکی تقدس کو شدید بناتا ہے۔ ویسے عصمت جسم و جان کی فنکار ہیں جس کا اظہار ذیل کے اقتباسات سے ہوتا ہے:

"ہاں بھئی بہت عشق کئے، یہاں تک کہ گنتی بھی یاد نہیں، پہلا عشق دس گیارہ برس کی عمر میں...... ہر خوبصورت لڑکے کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھی لیکن عشق میں مرنے کا کبھی نہ سوچا" (ص ۴۳)

"ایک بار بنے بھائی سے بھی کہا تھا کہ سب سے عشق کر چکی......اب آپ سے بھی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ انہوں نے ڈانٹ دیا...... بے چارے۔" (ص ۴۳)

ایک جگہ نئے عہد کی لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں:

"شادی مت کرو، دوست بنو، محبوبہ بہت اچھی رہتی ہے۔" (ص ۷۵)

لیکن یہ سب رواروی کی باتیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ عصمت پر فحشیات کا غلبہ ہے۔ ان کا مقصد بس ان ناگوار حد بندیوں سے ہے جو خواتین کی تمام تر حسی کیفیات کو سلب کر دیتی ہیں۔

بہر حال ٹورنٹو (Toranto) میں قیام پذیر شکیلہ رفیق کو یادوں کے اس خوبصورت مرقع کی پیشکش پر مبارک باد دی جاتی ہے۔ سرورق پر عصمت آپا کی جلال و جمال کی چسپاں تصویر، فہمیدہ ریاض کی فہمائش پر مبنی "تعارف اور تعریف" سحر انصاری کی رائے 'عقیدت کا سفر'، نیز فلیپ پر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر وارث علوی، جوگندر پال، قیصر تمکین اور عذرا عباس کے تاثرات اور خطوط جذبات کے منسلکہ اقتباسات سے مزین یہ کتاب "عصمت شناسی" میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ کتاب بہت حد تک طباعتی اغلاط سے پاک ہے سوائے اکا دکا کے۔ لیکن ص ۱۰۴ پر 'مشعل راہ' کے بدلے 'مشتعل راہ' چھپ جانا ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بے کیفی کی فضا بھی طاری کر دیتا ہے۔

مبصر: راجو خان

نکتہ اور نکتہ داں

"مباحثہ" ۳۳ پیش نگاہ ہے۔ اس بار مضامین سبھی اچھے ہیں۔ اقبال مجید کی کہانی صرف کہانی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت تاریخی ہوگئی ہے۔ رحمان شاہی نے بھی "دھوپ کا سائبان" پیش کر کے سماج کو ٹھنڈک کا احساس کرایا ہے۔

"ہم سے پوچھے کوئی فسانۂ گل" عنوان پڑھ کر احساس ہوا کہ کسی نازنین کا ذکر ہوگا لیکن پردے سے کوئی اور برآمد ہوا۔ شفیع جاوید کا خاکہ لکھنا یا ان کی شخصیت سے پار پانا سب کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کیوں کہ شفیع جاوید ایک شخصیت کا نام نہیں ہے۔ ان میں بیک وقت تین شخصیت موجود رہتی ہے۔ کب کون آپ سے ہم کلام ہے اس کا فیصلہ بھی مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ شفیع جاوید سے ملنے گئے وہاں آپ کی ملاقات ایس ایم شفیع الدین سے ہوگئی۔ پھر تو آپ کو مایوسی ہوگی۔

عبدالصمد نے اپنے خاکے میں ایس ایم شفیع الدین کا ہی ذکر کیا ہے۔ کہیں کہیں شفیع جاوید کی جھلک بھی نظر آتی ہے لیکن صوفی جاوید کا ذکر تو اس خاکے میں ہو ہی نہیں پایا ہے۔

میرے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ میں ایس ایم شفیع الدین کا ماتحت رہا ہوں۔ شفیع جاوید سے تھوڑی سی دوستی بھی ہے اور صوفی جاوید کے ساتھ بھی میں نے وقت گزارا ہے۔ کبھی کبھی تو راز دار کی حیثیت بھی مل گئی ہے۔

جب بھائی عبدالصمد نے معاملہ چھیڑ ہی دیا تو میں بھی کچھ واقعات کا مختصراً ذکر کرنا چاہوں گا۔ تاکہ وہ باتیں بھی سامنے آجائیں جو اس خاکہ میں نہیں ہیں۔

[۱] شفیع جاوید پہلی بار ڈائرکٹر بنے۔ میں ان سے ملنے اس وقت پہنچا جب وہ لنچ کے لئے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو چار سینئیر آفیسر بھی تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پوچھا 'ارے تم کب آئے؟' پھر کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی کار میں بیٹھاتے ہوئے لنچ کے لئے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں فرمایا 'وہ سارے آفیسر اب تم سے جلنے لگیں گے۔'

[۲] ٹیلی گرام دے کر سمستی پور سے بلایا۔ یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے گھر پر ہی ہیں۔ میں از راہ محبت ان کے گھر پر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی طبیعت اور ناساز ہوگئی۔ دوسرے دن دفتر میں ملنے کا فرمان جاری ہوا۔ ملاقات کی تفصیل تلخ ہے۔ میں نے آئندہ نہ ملنے کی قسم کھالی۔

[۳] سمستی پور سے ایک ضروری کام سے پٹنہ آیا۔ ایک کاغذ پر ان کا دستخط درکار تھا۔ پی اے کو دیا تو اس نے کہا:

"آپ سے تو اچھا تعلق ہے، خود ہی کیوں نہیں کرا لیتے۔" میرا جواب تھا۔

"میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا اس لئے یہ زحمت آپ ہی کریں۔"

پی اے نے جب کاغذ دیا تو فرمایا:

"ارے نوری آیا ہے؟ وہ باہر کیا کر رہا ہے اسے اندر بھیجئے۔"

میں اندر گیا۔ ایس ایم شفیع الدین غائب تھے۔ ان کی کرسی پر شفیع جاوید وراجمان تھے۔ دن کا تین بج رہا تھا۔ سات بجے شام تک بیٹھائے رکھا۔ دفتری امور کے بجائے ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ شام میں اپنے ساتھ ہی لے کر نکلے کے چلو ڈیرا تک چھوڑ دوں۔ لیکن میں راستے میں ہی اتر گیا۔

[۴] بندیشوری دوبے چیف منسٹر تھے۔ او پی لال محکمہ کے وزیر تھے۔ اور دوبے جی کے خاص سمجھے جاتے تھے۔ شفیع ایک فائل پر ان سے گفتگو کرنے گئے۔ انہوں نے دھونس والے انداز میں کہا۔

"آپ کو معلوم ہے بندیشوری دوبے میرے باپ ہیں؟"

"معاف کیجئے گا مجھے اس رشتے کی خبر نہیں تھی۔" شفیع نے کہا اور فائل لے کر نکل گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا:

"منتری جی وہ تو آپ کو گالی دے کر چلا گیا۔" منتری کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔

[۵] ایک زمانے میں آر یو سنگھ محکمہ کے سکریٹری ہوا کرتے تھے۔ ڈائرکٹر کی کرسی پر کبھی

کبھی شفیع جاوید آ کر بیٹھ جاتے اور ایس ایم شفیع الدین کو چلتا کر دیتے۔ اسی بات پر سکریٹری سے ان بن ہو گئی۔ شفیع محکمہ کے راجپوت آفیسر (جن کی قربت آر یو سنگھ سے تھی) کو اپنے چیمبر میں بلاتے اور آر یو سنگھ کو خوب کھری کھوٹی سناتے۔ وہ انجام جانے بغیر دل کا بھڑاس نکالتے۔ سکریٹری تک باتیں بڑھا چڑھا کر پہنچیں۔ انہوں نے شفیع سے پوچھا:

''شفیع کچھ لوگ آپ کے بارے میں ایسا ویسا کہہ رہے تھے۔''

شفیع نے بڑی معصومیت اور ملائمیت سے جواب دیا:

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟''

''وہی تو مجھے خود حیرت ہو رہی ہے'' سکریٹری نے کہا۔

''حیرت تو مجھے بھی ہو رہی ہے سر۔

کیسے کیسے لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں؟''

[٦] ہم دونوں کا چیمبر آس پاس ہی تھا۔ ایک باران کا پی اے نریندر دوڑا آیا

''جلدی چلئے سر ورنہ انرتھ ہو جائے گا'' میں دوڑا گیا۔ وہاں ایک سابق وزیر بیٹھے تھے میرے آتے ہی شفیع نے مکا ٹیبل پر مارتے ہوئے کہا:

''میں کچھ بھی نہیں دوں گا جاؤ جو کر سکتے ہو کر لو''

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی میں سابق وزیر کو اپنے ساتھ لے آیا۔ انہیں ایک کی بجائے دو ڈائری دی اور ان سے معذرت طلب کرتے ہوئے معاملہ کو شانت کیا۔

بات صرف اتنی تھی کہ سابق وزیر نے اپنا سابقہ تاؤ دکھاتے ہوئے انہیں سرکار کا ملازم کہتے ہوئے اپنا حکم ماننے پر مجبور کرنا چاہا تھا۔

[٧] گلف وار کا زمانہ تھا۔ سرکار نے پٹرول ڈیزل کے خرچ پر نظر رکھنے کی تاکید جاری کی تھی۔ ایک بار مجھے بلا کر فرمایا۔

''تیل دینے کی ذمہ دار آپ کو سونپی جا رہی ہے۔ آپ کریں گے؟''

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ مجھے کوئی بھی کام سونپنے کا حق رکھتے ہیں۔''

میرے جواب پر انہوں نے کہا:

''آج کے حالات میں یہ جوکھم بھرا کام ہے، آپ پر دباؤ بنا رہے گا۔''

میں نے پوچھا:

''تیل دینے کا جو قانون ہے اس کی پابندی کرنی ہوگی؟''

"ہاں سوفی صد کرنا ہوگی۔ اسی لئے تو آپ کو یہ ذمہ داری دی جا رہی ہے۔"

"کوئی مجھ سے باز پرس تو نہیں کرے گا؟"

"نہیں آپ بے فکر ہو کر کام کریں۔"

اس کے ایک ہفتہ بعد ان کا ڈرائیور پٹرول کا کوپن لینے آیا۔ میں نے حساب کیا تو وہ اپنا کوٹہ ایک سو پچیس لیٹر لے چکا تھا۔ میں نے مزید تیل دینے سے انکار کر دیا۔ ڈرائیور نے ساری بات ان سے کہہ کر مجھے تیل دینے کا حکم دینے کہا۔ انہوں نے کہا:

"میں جانتا ہوں وہ تیل نہیں دے گا۔ تم رکشا لاؤ مجھے گھر جانا ہے۔"

[۸] ڈائرکٹر بننے کے بعد جمعہ و نماز غائب۔ زماں صاحب نے کہا:

"سر آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔" میں لگا رہا۔ کبھی طہارت کا مسئلہ کبھی کپڑے کی طہارت آڑے آئی لیکن وہ راہ پر آہی گئے۔ جمعہ کی نماز ادا کی۔ ہم سب انہیں کی گاڑی سے مسجد گئے۔ میں سہ پہر کسی کام سے اندر گیا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"جمعہ تو پڑھوا ہی دیا اب عصر بھی پڑھواؤ گے کیا؟"

[۹] ایک شام دفتر سے نکلے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"یار آج تھک گیا ہوں چلو تمہارے یہاں کی چائے پی جائے۔ میں نے جھٹ بیگم کو فون کیا۔

"ڈائرکٹر صاحب چائے پر آرہے ہیں۔ دو چار آفیسر اور بھی ہوں گے۔ جھٹ سے سب انتظام کر لینا۔"

ان کے ساتھ شکلا اور میڈم بھی ہو گئیں۔ میڈم اسی فلیٹ کی تیسری منزل پر تھیں اور میں اور شکلا چوتھی منزل پر۔ تیسری منزل پر آئے اور دھیمی آواز میں بولے۔

"یار اوپر آتے آتے تھک گیا اب اور نہیں چڑھا جاتا۔ پھر میڈم کے ساتھ ان کے فلیٹ کی طرف چل دئے۔ اس کے بعد جب بھی انہوں نے چائے کی فرمائش کی میں نے بیگم کو فون نہیں کیا کیوں کہ میں یہ جان گیا تھا کہ وہ تیسری منزل تک ہی چڑھ سکتے ہیں۔ چوتھی منزل ان کے بس سے باہر تھا۔ اور کبھی کبھی انہیں میڈم کو آنسوؤں سے روتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ صاحب نے کسی بات پر ان کی کلاس لگا دی ہے۔

[۱۰] ایک سہ پہر بلا کر کہا:

"یار طبیعت اچاٹ ہو رہی ہے۔ چلو ذرا منیر جا کر مخدوم یحییٰ منیری کے درٗ پر حاضری دی

جائے۔ پھر ان کے ساتھ میں اور کبھی کبھار میڈم بھی ساتھ چلتیں۔ ایک بار مظفر پور علاقے کے کئی بزرگوں کے مزار پر حاضری انہیں کے توسط سے نصیب ہوئی۔

[۱۱] امیر شریعت حضرت مولانا عبدالرحمٰن سے بہت انسیت تھی۔ ایک بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ حد درجہ احترام کے ساتھ بیٹھے رہے۔ گفتگو ہوتی رہی۔ جب مولانا نے پان کا بیڑا اٹھانے کہا تو شفیع نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا:

''حضرت خود ہی عنایت کر دیں۔''

پھر وہاں سے پھلواری شریف کی ہی ایک تنگ گلی سے گزر کر ایک کمرے میں دستک دی۔ ایک بزرگ نے دروازہ کھولا جو برسوں سے خاموش رہ رہے تھے۔ بڑی عقیدت سے ملے۔ وہاں سے بھی تبرک ملا اور دست بوسی کے بعد واپس ہوئے۔ یہ شاہ ربانی صاحب تھے جو سات برس تک خاموش رہے۔

[۱۲] ایک بار رات دس بجے ان کے ساتھ پھلواری سے لوٹ رہے تھے۔ چتکوڑا اوور برج پر ایک جگہ گاڑی رکی۔ وہاں سر سے پاؤں تک چادر تانے ایک شخص پڑا تھا۔ انکے پاس بیٹھے اور دھیمی آواز میں درود پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد چادر سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ پھر اٹھ بیٹھا۔ کوئی گفتگو نہیں۔ دعا کی درخواست کی اور انہیں دس روپئے کا نوٹ دیا۔ میں نے بھی دس روپیہ بڑھا دیا۔ میرے نوٹ کو انہوں نے شفیع کے نوٹ کے اندر رکھ لیا۔ واپسی میں شفیع نے کہا۔

''نوری تم نے دیکھا انہوں نے تمہیں میری حفاظت میں دے دیا'' پھر بولے۔ یہ ڈیوٹی والے بزرگ ہیں۔ دن میں ہائی کورٹ کے سامنے والی سڑک کے ڈیوائیڈر پر چادر تانے پڑے رہتے ہیں اور رات میں یہاں قیام رہتا ہے میں نے بعد میں دونوں باتوں کی تصدیق کر دی اس کے بعد اکثر شفیع دفتر پہنچتے اور اپنے ڈرائیور رام بلی کو دس روپئے کا نوٹ دے کر کہتے:

''پاؤ روٹی اور پانی لے کر حضرت کے پاس جاؤ اور انہیں کھلا کر آؤ۔''

ایک بار ڈرائیور نے آ کر بتایا کہ وہ روٹی کھلا کر لوٹ رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار آئی اور ڈیوائیڈر پر چڑھ کر ان کو کچلتے ہوئے چلی گئی۔ یہ سن کر دن بھر اداس رہے اور کوئی کام نہ کر سکے۔

[۱۳] اکثر میرے یہاں آئے ادیبوں کی ضیافت میں پیش پیش رہتے۔ کبھی شمس الرحمٰن فاروقی کبھی بیگم وجوگندر پال، کبھی مظہر امام و مبینہ امام کبھی 'آئندہ' کے مدیر محمود واجد کبھی کوئی اور۔ ہر بار مجھ سے زیادہ میزبانی کے فرائض وہی انجام دیتے۔

[۱۴] ایک طالب علم میری بیگم ڈاکٹر شائستہ انجم نوری کی گائڈنس میں شفیع جاوید کے فن

اور شخصیت پر پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ میں لے کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے بھر پور مدد کا وعدہ کیا۔ شفیع جاوید اور صوفی جاوید دونوں نے اس کی بھر پور مدد کی۔ ایک بار حسب وعدہ وہ نہیں پہنچا اور وہ انتظار کرتے رہے۔ دوسری بار جب گیا تو اس کی ملاقات ایس ایم شفیع الدین سے ہوگئی۔ اب اس لڑکے کا یہ حال ان کے یہاں جانا تو دور ان کے نام سے کانپنے لگتا ہے۔

[۱۵] اپنی بیگم بلقیس سے وہ بیحد محبت کرتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انکے ایک عزیز دوست اور فنکار نے نہ تو عیادت کی اور نہ ہی انکے قل میں شریک ہوا۔ فرمانے لگے۔

"نوری، میں نے اسے حرف غلط کی طرح اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دیا ہے۔"

پھر گویا ہوئے:

"میرے بڑے سالہ امریکہ سے پرسہ دینے آئے، گھنٹوں دروازے پر کھڑے پکارتے رہے:

"شفیع میں امریکہ سے صرف بلقیس کی قبر پر تمہارے ساتھ فاتحہ پڑھنے آیا ہوں۔ دروازہ کھولو"

جواب ملا:

"سالے - زندگی میں کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ بلقیس مر گئی کہ زندہ ہے۔ آج فاتحہ پڑھنے آئے ہیں۔"

دل کے دروازے کی طرح گھر کا بھی دروازہ نہ کھلا اور وہ واپس ہو گئے۔ ان سارے واقعات کی روشنی میں شفیع جاوید کے مختلف خدوخال ظاہر ہوتے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ کوئی یہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ وہ شفیع جاوید کو مکمل طور پر جانتا ہے۔ شفیع جاوید کا مزاج محبوبہ اور موسم کی طرح کب بدل جاتا ہے اس کی جانکاری خود ان کو بھی نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کو اکثر ادب کا اوگھڑ کہتا ہوں۔

٭ مشتاق احمد نوری، چھپرہ

"مباحثہ" برابر مل رہا ہے۔ اس عنایت کے لئے ممنون ہوں۔ اس کے ادبی معیار کا گراف بلند تر ہو رہا ہے۔ شمارہ ۳۲ پیش نظر ہے۔ مطالعہ جاری ہے۔ کلام حیدری پر مضمون (معصوم عزیز کاظمی) متاثر کرتا ہے۔ میں موصوف سے ذاتی طور پر واقف نہ تھی لیکن ان کی شخصیت پر کچھ اور تحریریں بھی نظر سے گزری ہیں۔ اور یہ مضمون پڑھ کر تاثر ضرور قائم کرتی ہوں کہ موصوف صاف گو انسان اور بہت عمدہ مدیر تھے۔ اپنے رسالے میں میری تحریریں شوق سے شائع کرتے تھے۔ شہریار

کے متعلق دونوں مضامین کسی قدر سرسری ہیں۔ شہریار پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب نقادوں کے پاس ان کی شاعری پر مزید لکھنے کے لئے شاید کچھ بچا ہی نہیں لیکن مدح سرائی تو کی ہی جا سکتی ہے۔ (ہماری اردو تنقید کم و بیش اسی اساس پر قائم ہے، اور گروہی وفا داریوں پر۔ ورنہ بعض دوسرے پانچ چھ مجموعوں کے خالق معروف اور اعلیٰ سطح کے شعرا پر کچھ کیوں نہیں لکھا جاتا؟ سرد مہری اور سکوت مصلحت آمیز کی بھی ایک حد ہوتی ہے) بہر حال جو کچھ بھی ہو، امید تو کی جا سکتی ہے کہ فن کار Ultimately اپنی تخلیق پر زندہ رہتا ہے، اور اسی سے پہچانا جاتا ہے۔

فہیم اختر کا افسانہ مردوں کی ذہنیت کے ایک بنیادی نفسیاتی وصف کی طرف اشارہ ہے اور کہکشاں انجم نے بچوں کی ملازمت کے پس منظر میں ایک اہم ڈائیلیما کا انکشاف کیا ہے۔ لیکن کہکشاں انجم نے انجام میں اس ڈائیلما کی طرف مفکرانہ نظر ڈالنے کے بجائے ایک نصیحت آمیز جملے پر اس کا افسانے کا اختتام کیا ہے جو محل نظر ہے۔ (فنی نقطہ نظر سے)

'ساز تخلیق' کے تحت پیش کردہ، قمر رئیس، شاہد اختر، شاہد عزیز، شارق، عدیل اور نجمہ محمود کی منظومات بہتر ہیں۔ (نثری نظم کو میں شعریات کے زمرہ سے باہر سمجھتی ہوں) غزلیات میں اچھے اشعار نظر سے گزرے۔ آپ کے خصوصاً اور 'مباحثہ' کے عموماً تبصرے بعض اعتبار سے حاصل شمارہ ہوتے ہیں۔ مفصل اور مناسب۔ سرسری تبصروں سے قطعاً مختلف۔ یہی آپ کے اداریوں کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔

✠ ساجدہ زیدی، دہلی

''مباحثہ'' شمارہ ۳۳ مل گیا تھا۔ غزلوں کی اشاعت کے لئے مشکور و ممنون ہوں۔ مشمولات میں بیشتر تخلیقات معیار و افکار کی بدولت سنجیدگی سے پڑھنے کا تقاضہ کرتی ہیں۔ مشتاق صدف کا کلیدی مضمون جو گوپی چند نارنگ کے سلسلے میں ہے۔ فراق گورکھپوری کی غزلیہ شاعری، زبان و بیان کے رموز و نکات نیز ہندی اردو الفاظ کی آمیزش سے تخلیقی تلازمے گھڑنے کے رجحانات کی نشاندہی کامیابی سے ہوتی ہے۔ ذہن جدید میں بھی غزل کے دفاع میں فراق گورکھپوری کی لکھی گئی تحریر ان دنوں خوب ہلچل پیدا کر رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فراق گورکھپوری ہندوستانی آب و ہوا میں شعری فضا تخلیق کرنے والے شاعر ہیں۔ یہ زمین اور زبان دونوں کی گھلاوٹ سے ترتیب پائے ذہن کی کامیابی سے عکاسی کرنے والے شاعر ہیں۔

شان الرحمٰن اور شمس بدایونی دونوں حضرات کے حمد و مناجات کی انفرادی حیثیت مسلم ہے۔ دیگر مضامین ابھی نہیں پڑھ پایا ہوں۔ سید امین اشرف کے منتخب اشعار میرے لئے نعمت مترقبہ

سے کم نہیں ہیں۔ شمیم قاسمی اور عطا عابدی پر آپ کے مضامین ان دو حضرات کی شاعرانہ ذہنیت کو سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں۔

٭ رونق شہری، جھریا

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ "مباحثہ" برصغیر کے ان چند محدود رسائل میں سے ہے جس کے ہر تازہ شمارے کا مجھے شدت سے انتظار رہتا ہے۔ گونا گوں نیز موزوں و متناسب عنوانات سے آراستہ پیراستہ مشمولات میں تنوع، فکری گہرائی و گیرائی، اس پر مستزاد آپ کے وقیع، موقر رشحات قلم قاری سے رسالے کے غائر مطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

'غزل ہے شرط' کے ذیل میں غزل کے منفرد ممتاز شاعر سید امین اشرف صاحب کے منتخب اشعار سے قند مکرر کا لطف حاصل ہوا۔ موصوف کی خود احتسابی لائق ستائش ہے۔ پیش کردہ اشعار کو شاہ بیت کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر کے موجودہ شعری منظر نامے میں سید امین اشرف اپنے موضوع اور انداز غزل گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں روایتی لب و لہجہ اور غیر رسمی انداز، فنکارانہ حسن کے ساتھ پوری طرح گھل مل گئے ہیں۔ اس فطری امتزاج سے ان کی غزل میں ایک امتیازی شان پیدا ہوگئی ہے۔

٭ غلام مرتضیٰ راہی، فتح پور

آپ کا رسالہ "مباحثہ" ریاست بہار کی شاندار صحافتی (ادبی) روایت کو بھی نباہ رہا ہے۔ شمارہ ۳۲ اس لحاظ سے بھی یادگار رہے کہ اس میں پروفیسر قمر رئیس کا آخری (غالباً) مضمون پڑھنے کو ملا، جو ان کے مزاج اور معیار سے ہم آہنگ ہے اور دوسری آخری تخلیق ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی مرحوم کی ہے۔ جو حتمی طور پر آخری تحریر خط کی شکل میں ہے۔ عبدالصمد کا افسانہ "جی میم صاحب" نئے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کس طرح ہماری تہذیبی قدریں ختم ہو رہی ہیں، اس کا اظہار عبدالصمد نے بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔

٭ سید احمد قادری، گیا

"مباحثہ" کا ہر شمارہ مطالعے میں رہتا ہے۔ آپ جس محنت اور سنجیدگی کے ساتھ ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ بلاشبہ لائق ستائش ہے۔

٭ راشد انور راشد، علی گڑھ

"مباحثہ" ۳۳ جستہ جستہ پڑھا۔ مشمولات کے تعلق سے آپ کی نپی تلی رائے قاری کو رشحات قلم کے نفس تک پہنچنے میں معاونت کرتی ہے۔ عبدالصمد کا افسانہ "جی میم صاحب" عنوان کے

اعتبار سے ''جی آیا صاحب'' کی یاد دلا گیا۔کلکٹر بھی ہمارے ہی معاشرے کا ایک فرد ہے۔ (عورت ہو یا مرد) لیکن عبدالصمد کے افسانے کی کلکٹر کو عوام شروع سے جینس پینٹ میں دیکھتے آئے تھے۔اچانک خاتون خانہ کے لباس میں دیکھ کر ہضم نہیں کر سکے۔دیگر افسانے بھی غنیمت ہیں۔

قمر رئیس مرحوم کی نظم ''اپنا پورٹریٹ'' اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ انہیں موت کی آگاہی ہو چکی تھی۔عظیم آباد کے ایک اور بزرگ شاعران دنوں عجیب قسم کے خلجان میں مبتلا ہیں۔شاید یہ موت کا پیش خیمہ ہے۔منظر اعجاز،صوفیہ انجم تاج،خاور خان سرحدی کی غزلوں کے بعض اشعار اچھے لگے۔

راجو خان کا خط سنجیدگی سے لئے جانے کا متحمل ہے۔

٭ منیر سیفی، پٹنہ

شمارہ اگست تا دسمبر ۲۰۰۹ء کے مشمولات حسب معمول خوب ہیں۔'خدو خال' کا اضافہ بہت خوب۔اس کے تحت دونوں ہی تحریریں اپنے خالق کے تخلیقی اظہار و احساس کا اشاریہ ہیں۔ عبدالصمد صاحب نے تو مجھ جیسے کم فہم کے باطن میں اضطراب پیدا کر دیا۔کیا خوبصورت انداز بیان ہے۔سبحان اللہ۔

مشتاق صدف نے حوالے اور دلائل سے اپنے مضمون کو پائیداری عطا کی ہے۔مختصراً انہوں نے کئی اشارے کر دئے ہیں۔یہ ایک طرح سے ان کی تحریر کی خوبی ہی کہی جائے گی۔ افسانوں میں زندگی محسوس ہوئی۔رحمٰن شاہی نے متاثر کیا۔ہمارے عہد کے دو عمدہ شاعروں شمیم قاسمی اور عطا عابدی کی شاعری پر آپ کی تحریروں کے عنوان برجستہ اور مکمل ہیں۔یہی ان کی شاعری کے بنیادی حوالے ہیں۔اگر چہ دونوں Treatment of Subject میں الگ الگ اپروچ رکھتے ہیں۔مگر یہ اپروچ ان کی اپنی ہے۔شمیم قاسمی کے یہاں جو استعاراتی نظام موجود ہے اس نے ان کی شاعری کو زندگی کی توانائی سے ہمکنار کیا ہے۔ان کے یہاں ناقدانہ نگاہ بھی ہے اور اپنے ردعمل کا طنزیہ اظہار بھی۔ان کی زمینوں کی بابت کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ: ''اٹھا چکے ہیں زمیں دار ان زمینوں کو'' عطا عابدی کے بیشتر اشعار ایسا آئینہ خانہ سجاتے ہیں جس میں تہذیبی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور سماجی زندگی کا انتشار نمایاں نظر آتا ہے۔عطا عابدی حسین روایتوں اور مثبت قدروں کی بازیافت کے خواہاں ہیں۔ان کی شاعری ایسی ہی مقصدیت سے عبارت ہے۔

امین اشرف صاحب کے پچاس اشعار سے محظوظ ہوا۔

خدا آپ کو صحت پر قائم رکھے۔

* عبید الرحمٰن، نئی دہلی

حالیہ شمارے میں حمد و دعا جیسی تقدیسی منظومات معیاری ہیں۔ البتہ نعت، مدحت رسول کے شرعی و شعری تقاضوں پر پوری نہیں اترتی۔ دنیا کے تاجداروں کی شان میں کہے جانے والے قصائد کی کمزوری نامطبوع قرار دی جاتی ہے تو تاجداروں کے تاجدار، وجہ تخلیق کائنات حضرت محمد ﷺ کے شان مرتبت کے بیان میں نعت رسول کا بیان کس قدر اعلیٰ ہونا چاہئے۔ شکیل سہسرامی نے اس امر کا مطلق خیال نہیں رکھا۔

ہر زبان کی اپنی ادبی تہذیب اور علاحدہ شناخت ہوتی ہے۔ کوئی ادبی تہذیب کسی دوسری زبان کی تہذیب میں مکمل طور پر ضم نہیں ہو جاتی۔ ہاں ایک دوسرے کے اثرات کو قبول کرنا ہر تہذیب کا فطری داعیہ ہوتا ہے۔ فراق نے 'روپ' کی رباعیوں میں سنسکرت اور قدیم ہندی زبانوں کی ادبی تہذیب کے وہ مرقعے پیش کئے ہیں جن کا تعلق عشق جنس و جمال سے ہے۔ ان دونوں زبانوں میں 'حسن' بے پردہ اور 'عشق' جنسیاتی ہوس اور لمسیاتی کیف سے عبارت ہے۔ جبکہ اردو تہذیب میں حسن مستور اور عشق روحانی سرور کا تصور عام ہے۔ معاملات عشق میں جنس مخالف کے تصور کو اردو تہذیب میں غیر شائستہ اور عریانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ اور ہاشمی وغیرہ کے عشقیہ کلام کو اردو غزل میں کوئی بلند مقام حاصل نہ ہو سکا، کیوں کہ ان کے یہاں چوما چاٹی اور لمسیاتی لمحات کی برہنہ تصویر کشی ہوئی ہے۔ غزل میں یہ موضوع اباحت کے دائرے میں آ بھی جائے تو بسا غنیمت، لیکن رباعی کے مزاج سے تو یہ قطعی لگا نہیں کھاتا۔ جنسیت زدہ ذہنیت اس عمل پر بھلے ہی بغلیں بجائے لیکن ثقہ ناقدین کے یہاں رباعی گوئی میں یہ موضوع لائق استحسان نہیں ہے۔

ابو المجاہد زاہد جماعت اسلامی کے معتبر اور بزرگ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری یقیناً رنگ و نور لئے ہوئے ہے۔ احمد سجاد نے نہایت مختصر مگر جامع مقالہ ان کے تعارف میں سپرد قلم کیا ہے۔ ان کی شاعری کے میزان میں 'شہرت' کے 'پاسنگ' نہ بھی ہوں، فن کے بٹے ضرور ہوتے ہیں اور وزن بٹے سے ہوتا ہے، پاسنگ سے نہیں۔

ظہیر انور کا مضمون ظفر اوگانوی کے فن کی کہانی سناتا ہے۔ مضمون نگار نے نہایت عرق ریزی سے ان کے فن کا تجزیہ کیا ہے۔ اور افسانوی ادب مین ظفر اوگانوی کے مقام کا تعین کیا ہے۔

صغیر افراہیم مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبہ اردو سے جڑے ہیں۔ ہندی اردو دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کا میلان افسانہ وناول کی تنقید کی طرف ہے لیکن اردو شاعری پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ان کی بساط نقد شعر پر اتر پردیش کی عصری شاعری کے مہرے دکھائی دیتے ہیں۔'مباحثہ' کا تازہ مضمون 'راہ مضمون تازہ بند نہیں' اس پر دال ہے۔ معصوم عزیز کاظمی اور عبداللہ جاوید کے مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔عبدالصمد اور پروین شیر نے شفیع جاوید اور قمر رئیس کے خدوخال بڑے موثر انداز مین قلمبند کئے ہیں۔خصوصی مطالعے میں آپ کے دونوں مضامین شمیم قاسمی اور عطا عابدی کے فکروفن کا بہترین تجزیہ ہیں۔

اقبال مجید کا افسانہ دل کو چھو گیا۔البتہ ریاض قاصدار کے افسانے 'کامدانی فراک' کی زبان میں تصنع کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔انہوں نے عمداً اپنی زبان کو عربی لفظیات ٹھونس کر بوجھل بنادیا ہے۔مثلاً اردو میں کسان کے لئے 'مزرع' کبھی استعمال نہیں ہوتا،اس لئے کہ ضمہ کے ساتھ یعنی میم پر پیش لگانے سے 'مزارع' کسان کے معنی دیتا ہے۔اگر اسے اعراب کے بغیر لکھا جائے تو پڑھنے والا اسے 'مزارع' یعنی زبر کے ساتھ پڑھے گا اور بعیں صورت اس کے معنی کھیتیاں ہوں گی۔لفظ 'ارض' کی جمع 'اراضی' ہے مگر اسے جمع الجمع 'اراضیات' بنادیا گیا ہے، جو ازروئے قواعد درست نہیں۔رحمٰن شاہی کا افسانہ 'دھوپ کا سائبان' اچھا ہے۔افسانہ نگار نے لفظ 'مزار' کو کہیں مزکر تو کہیں مونث کی صورت میں استعمال کیا ہے۔مشتاق احمد وانی کے افسانے میں افسانویت کا فقدان ہے۔افسانے کا اختتام بھی غیر موثر ہے۔

غزل میں شیریں لبوں کا بیان تو اکثر ہوا ہے، بلکہ یہی شیرینی غزل کی جان بن گئی ہے۔لیکن شمیم قاسمی نے محبوب کے ہونٹوں کو نمکین بنادیا ہے۔ان کے یہاں 'ریگ ساگر' کی ترکیب بھی محل نظر ہے۔

'مباحثہ' کے دیگر مشمولات بھی اچھے ہیں۔ کتابوں پر صحیح تبصرے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس عمر میں بھی کتاب شناسی کے لئے پڑھنے کی للک آپ کے اندر کیوں کر باقی ہے۔

٭ سید یحییٰ نشیط ،کل گاؤں

'مباحثہ' کے مطالعہ سے ازحد خوشی ہوئی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے اہم ترین اردو ادبی جرائد میں کیا جاسکتا ہے۔ادب کے مختلف شعبوں کا احاطہ انتہائی خوبصورتی اور محنت کے ساتھ کیا گیا ہے۔خاص طور پر مضامین کا سلسلہ 'افکار' کے نام سے بہت ہی پسند آیا۔عام طور پر ادبی جرائد میں سنجیدہ مضامین کی کمی شدت سے محسوس کی

جاتی ہے لیکن 'مباحثہ' میں شائع شدہ مضامین انتہائی جاندار اور فکری سطح پر بہت بلند ہیں۔ شاعری میں نظموں اور غزلوں کا گوشہ بھی خوب چہکتا اور مہکتا ہوا ہے۔ ساقی فاروقی صاحب کے اشعار کا انتخاب اور لطف الرحمٰن صاحب کا خصوصی مطالعہ بھی خوب ہے۔

٭ کامران ندیم، یو ایس اے

گزشتہ تمام شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی معیاری مشمولات سے آراستہ ہے۔ شمس بدایونی، شان الرحمٰن، محمد خالد اللہ عبیدی اور شکیل سہسرامی کے قلم کی پاکیزہ روشنی قلب و ذہن کو روحانیت سے بھر دیتی ہے۔ مشتاق صدف، معصوم عزیز کاظمی اور عبداللہ جاوید کی تحریریں قابل قدر ہیں۔ اقبال مجید، ریاض قاصدار، رحمٰن شاہی اور مشتاق احمد وانی کے افسانے زندگی کے آس پاس ہیں۔ ناوک حمزہ پوری اور سلطان اختر کی رباعیاں نیز پروین شیر اور پرویز مظفر کی نظمیں بھی ذہن پر نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ عطا عابدی کی دس غزلیں ان کی فکری پختگی و بلندی کا پتہ دیتی ہیں۔ موصوف کی شعری پرواز پر آپ کا مضمون بھی سیر حاصل ہے۔ مجموعی طور پر اس شمارے میں اتنا کچھ ہے کہ میرا خیال ہے کہ اسے ہر قاری محفوظ کر لے گا۔

٭ مراق مرزا، ممبئی

٭٭٭

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی اہم مطبوعات

☆ ادب وتنقید (2010)

1	مقالاتِ طرزی	ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (طلبہ ایڈیشن) -/100 (لائبریری ایڈیشن)	150/-
2	سید سعادت علی خاں: شخصیت اور شاعری	پروفیسر عبدالمنان طرزی	250/-
		(لائبریری ایڈیشن)	300/-
3	سازِ حوادث سے ہم آہنگ شعراء (جلد اوّل)	انوری فرمان	250/-
4	ادب کے ستون	سیّد بشیر احمد	200/-
5	تجلّیاتِ حفیظ	مرتب: عبیدالرحمٰن	500/-
6	ترقی پسند تحریک، سیڑھی یا سانپ	ڈاکٹر تاج پیامی	150/-
7	کھوٹا سونا	مشتاق راہی	100/-
8	اُردو افسانہ فکری وفنی مباحث	عظیم الشان صدیقی	300/-
9	دلّی کالج تاریخ اور کارنامے	عبدالوہاب	140/-
10	مقالاتِ عاکف	ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی	200/-
11	شمس الرحمٰن فاروقی اور تفہیم غالب	ریحانہ اختر	300/-
12	فن کے کچھ نئے تنقیدی زاویے	ڈاکٹر ماجد داغی	200/-
13	رفیقِ راز	ریحان اختر	250/-
14	حیدرآباد میں اُردو ادب کی تحقیق	ڈاکٹر آمنہ تحسین	400/-
15	مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی	ڈاکٹر نذیر فتح پوری	100/-
16	اُردو میں تاثراتی تنقید	ڈاکٹر محمد مونس	180/-
17	اقبال کی عصری معنویت	مرتب: ڈاکٹر مشتاق احمد	300/-
18	تاریخ سنبھل	حکیم ظل الرحمٰن	175/-
19	شناخت اور ادراکِ معنی	وہاب اشرفی	350/-
20	نئی سمت کی آواز (تنقیدی مضامین)	وہاب اشرفی	160/-
21	تفہیم وفکر معنی (تنقیدی مضامین)	وہاب اشرفی	175/-
22	قدیم مغربی تنقید	پروفیسر وہاب اشرفی	100/-
23	احمد وصی: شاعری اور شخصیت	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	150/-
24	آبِ رواں	مولانا محمد مصطفیٰ اشرفی، مرتب: محمد اقبال	450/-
25	جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سمپورن اتہاس (2010-1920) (ہندی)	ڈاکٹر عبدالوہاب	400/-
26	Frontiers of Despair in the First World War Poetry (1914-18)	Dr. M. Imtiyaz Ahmad	160/-

27	اکرام نامہ	ڈاکٹر محمد معظم الدین	350/-
28	جدید تنقید ایک جائزہ	ڈاکٹر خورشید سمیع	150/-
29	درگا سہائے سرور جہاں آبادی	الف ناظم، اسد برکاتی	250/-
30	صواب دید	ڈاکٹر عمران ٹاک	200/-
31	اُردو تنقید اور ابن فرید	ڈاکٹر عمران ٹاک	175/-
32	منہاج پریم چند	ڈاکٹر رابعہ مشتاق	200/-
33	اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار	تسنیم فاطمہ امروہوی	200/-
34	اُردو لسانیات کی تاریخ	درخشاں زرّیں	300/-
35	فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر	شافع قدوائی	250/-
36	قرأت اور مکالمہ	کوثر مظہری	350/-
37	اردو صحافت: زبان، تکنیک، تناظر	مشتاق صدف	300/-
38	میڈیا، اُردو اور جدید رجحانات	سہیل انجم	230/-
39	دور کی آوازیں (خطوط کا مجموعہ)	جیلانی بانو	500/-
40	مولانا آزاد بحیثیت شاعر	ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی	125/-
41	داغ بحیثیت مثنوی نگار	ڈاکٹر فرید پربتی	200/-
42	منڈیر پر بیٹھا پرندہ (تنقید)	ڈاکٹر نسیم ابن صمد	200/-
43	بساط نقد (تنقید)	ڈاکٹر افشاں ظفر	200/-
44	سات عجوبے (جنرل نالج)	ڈاکٹر عزیز احمد عروسی	300/-
45	سید شاہ وجیہہ الدین منہاجی کی متفرق نگارشات مع نسب نامہ اور شعری تخلیقات	درشہوار تارا منہاجی	120/-
46	The Plight of Dalits	Dr. Anjum Ashrafi	125/-
47	Relevent Problems of Islamic History & Culture	Dr. Anjum Ashrafi	130/-
48	ہندوستانی تہذیب اور اردو	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	150/-
49	سر سیّد تحریک کا سیاسی و سماجی پس منظر	پروفیسر افتخار عالم خاں	300/-
50	عکس فرنگ آئینہ اردو میں	عالم اعظمی	200/-
51	ترقی پسند تنقید: نظریہ و عمل	ڈاکٹر ابوا رشد	350/-
52	1857 کے انقلاب کا عینی شاہد جارج پیش شور	ڈاکٹر راحت ابرار	250/-
53	نام میں کیا رکھا ہے (انشائیے)	سیّد مشہود جمال	200/-
54	درہائے نجم	ڈاکٹر عزیز بانو	200/-
55	اردو تنقید کے فروغ میں اختر اورینوی کی خدمات	ڈاکٹر عامر مصطفیٰ صدیقی	160/-
56	کاروانِ ادب	ڈاکٹر سیّد بشیر احمد	200/-
57	درپسِ آئینہ (شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے خطوط پروفیسر وہاب اشرفی کے نام)	مرتب: ہمایوں اشرف	(زیرِ طبع)

نلول، افسانے، کہانیاں، ڈرامے

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
58	ایوانِ غزل (ناول)	جیلانی بانو	275/-
59	بدلتے رُت کی کہانیاں (افسانوی مجموعہ)	ظفر حبیب	120/-
60	راستہ بند ہے (افسانوی مجموعہ)	جیلانی بانو	130/-
61	ٹوٹا ہوا سہارا (افسانوی مجموعہ)	عبیداللہ چودھری	150/-
62	اے ماؤ، بہنو، بیٹیو	کشمیری لال ذاکر	100/-
63	دوسری عورت (افسانے)	نثار راہی	150/-
64	خوفناک (ناول)	نقشبند قمر نقوی	200/-
65	ایشہ (ناول)	مترجم: مظہرالحق علوی	300/-
66	خانقاہ (ناول)	مترجم: مظہرالحق علوی	275/-
67	باتاں مُڈھ قدیم دیاں (افسانے)	سوہندر سنگھ ونجارا بیدی	200/-
68	بند مٹھی (افسانے)	نسرین بانو	150/-
69	शेष शिनाख्त	सुरेन्द्र प्रसाद यादव	150/-
70	بکھرے اوراق (ناول)	عبدالصمد	200/-
71	عنکبوت (افسانے)	شموئل احمد	200/-
72	درد کی فصل (افسانے)	کرشن بیتاب	100/-
73	گناہ گاروں کے درمیان	مردولا بہاری، مترجم: شاہد جمیل	160/-
74	अंगप्रदेश की हिन्दी काहानियाँ	चन्द्रप्रकाश जगप्रिय	150/-
75	अंगप्रदेश की हिन्दी कविताएं	चन्द्रप्रकाश जगप्रिय	150/-
76	شکستہ بتوں کے درمیان (افسانوی مجموعہ)	سلام بن رزاق	220/-
77	نیو کی اینٹ (افسانوی مجموعہ)	حسین الحق	200/-
78	خوابوں کی خوشبو (افسانوی مجموعہ)	عابد علی خاں	120/-
79	کینوس پر چہرے (منتخب افسانے)	قاسم خورشید	200/-
80	کانچ کا بازیگر (ناول)	شفق	160/-

حکایات و واقعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
81	حکایاتِ رومیؒ (پیپر بیک)	مرتبہ: طالب الہاشمی	70/-
82	حکایاتِ رومیؒ (مجلد)	مرتبہ: طالب الہاشمی	90/-
83	حکایاتِ سعدی (دلچسپ ونصیحت آموز)	طالب ہاشمی (پیپر بیک) 60/-	(مجلد) 80/-

سوانح، خود نوشت، طنز ومزاح، خاکے

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
84	جوگندر پال شخصیت (سوانح)	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	100/-
85	پانچواں درویش (جلد دوم) (خودنوشت)	نقشبند قمر نقوی بھوپالی	350/-

شاعری

86	مُشتِ غبار	ہمدم صدیقی	100/-
87	ورق ورق اُجالا	منظر اعجاز	200/-
88	ہجومِ آئینہ	فرید پربتی	500/-
89	جمالِ ہم نشیں	خالد رحیم	150/-
90	تکمیل کی طرف	سرداری لال دھون کمل	100/-
91	کیکر کے سائے	قنبر علی	200/-
92	نسیمِ جاں	بشیر احمد بشیر	150/-
93	چاندنی کا آئینہ	فاطمہ تاج	200/-
94	پرواز	عزیز الرحمٰن عزیز سلفی	170/-
95	سنی سانگ	ڈاکٹر ایم مجتبیٰ احمد	125/-
96	بارہ قباؤں کی سہیلی	عذرا پروین	175/-
97	خزاں کا موسم رکا ہوا ہے	شکیل اعظمی	125/-
98	ہوا کے شامیانے میں	جعفر ساہنی	100/-
99	نفسِ ربا	محمد راشد	140/-
100	گلستانِ حافظ	محمد اقبال	200/-
101	دیوانِ حافظ	محمد اقبال	450/-
102	خیریات	رؤف خیر	200/-
103	نوشتِ نوا	عطا عابدی	200/-
104	دشتِ جنوں	سدرشن کنول	200/-
105	اپنے تماشے کا ٹکٹ	شارق کیفی	115/-
106	صدائیں تیز تھی لیکن	صابر عمر گالسولکر	200/-
107	زمانہ کچھ اور ہے	انجم بارہ بنکوی	100/-
108	پھول خوشبو ہوا	منیر سیفی	100/-
109	لمحات	ڈاکٹر یونس غازی	150/-

بچّوں کا ادب

110	کائنات اور اُس کی تخلیق	حنیف شیخ	100/-
111	پانی کی آلودگی، اوزون سُوراخ، عالمی حرارت، معدوم شجر کاری، تیزابی بارش، نیوکلیائی کثافت (چھ جلدوں کا سیٹ) (چار کلر)	ادریس صدیقی	270/-
112	چاند کیا ہے، سورج کیا ہے، زمین کیا ہے (تین جلدوں کا سیٹ) (چار کلر)	انیس صدیقی	90/-

کھانا پکانا، ڈکشنری

113	پھلوں کے کھانے اور خوش ذائقہ مصنوعات	محمد شبیر قمر	90/-
114	ذائقے دار پکوان	کنول عباس	80/-

5.	Practical Concise 21st Century Dictionary (Double Colour) English Into English & Urdu Size: 23x36/16 Pages: 704		Rs. 150/-
6.	Student Practical 21st Century Dictionary (English into English & Urdu)Size: 20x30/8 Pages: 800		Rs.225/-
7.	Gem Pocket 21st Century Dictionary (English into English & Urdu)		Rs. 45/-
8.	Gem Pocket 21st Century Dictionary Double Colour (English into English & Urdu)	Paper back	Rs. 55/-
		(Delux Edition)	Rs. 70/-
9.	21st Century Medical Dictionary (English into English & Urdu)		Rs. 200/-
10.	Technical Hindi,English, Urdu Dictionary by Zuber Ahmad Bhagalpuri (Size: 23x36/16 ,Pages: 272)		Rs. 200/-
11.	The Easy Dictionary of The Qur'an by Maulana Abdul Karim Parekh		Rs.120/-
12.	Standard 21st Century Dictionary(U.E.)(Delux Edition)		Rs. 300/-
13.	Academic 21st Century Dictionary (Urdu to English)	Size: 20x30/8 Pages: 800	Rs. 250/-
		(Delux Edition)	Rs. 350/-
14.	Practical Concise 21st Century Dictionary (Urdu Into English) Size: 23x36/16 Pages: 704		Rs. 150/-
15.	Concise 21th Century Dictionary (Urdu to English)		Rs. 110/-
16.	Gem Pocket 20th Century Dictionary (Urdu to English)		Rs. 45/-
17.	Gem Pocket 21st Century Dictionary (Urdu to English) (Double Colour)	Paper Back	Rs. 55/-
		Delux Edition	Rs. 70/-
18.	Jame Firoz-ul-Lughat (Urdu)		Rs. 400/-
19.	Jame Firoz-ul-Lughat (Urdu) Paster Binding		Rs. 280/-
20.	Jame Firoz-ul-Lughat (Urdu) (Delux Edition, 2 Vol.set)		Under Print
21	Jadeed Firoz-ul-Lughat Urdu (Size: 23x36/16)		Rs. 215/-
22.	Firoz-ul-Lughat Jadeed Urdu (Size: 20x30/16)		Rs. 120/-
23.	Jebi Firoz-ul-Lughat (Urdu)		Rs. 45/-
24.	Jebi Taleem-ul-Lughat (Urdu)		Under Print
25.	Taleemi Arabi Urdu / Urdu, Arabi		Under Print
26.	Farhang-e-Aamira		Under Print
27.	Farhang-e-Farsi (Jadid Lughat-e-Farsi)		Rs.150/-
28.	Ajaz-ul-Lughat Jadeed Urdu		Rs. 200/-
29.	Asaan Lughat-ul-Quran (Mualana Abdul Karim Parekh)		Under Print
30.	Misbah-ul- Lughat Arabi To Urdu		Rs. 350/-
31.	Lughat-e-Kishori (Pakistani)		Rs. 200/-

-:ملنے کا پتہ:-

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

MOBAHASA - VOL.8, ISSUE NO.34, 2010
Ashrafi House, Haroon Nagar, Sector-2, Patna-801505